جناب محرومؔ کا دل بادۂ حقیقت کا بھی لذت شناس ہے، حمد و نعت کی نظمیں اس کا بین ثبوت ہیں، عاشقانہ نظمیں اور غزلیں ان کی شاعری کے ابتدائی دور کی یادگار ہیں، آخر میں خندہ پارے کے عنوان سے چند فارسی غزلیں، قطعات اور رباعیاں ہیں، طنزیہ نظموں کے علاوہ انگریزی اور فارسی کے دلچسپ اور سبق آموز اشعار کو اردو شاعری کا جامہ اس خوبی سے پہنایا ہے کہ اصل کا دھوکہ ہوتا ہے، خیالات کی بلندی و پاکیزگی کے ساتھ الفاظ کا حسن، بندش کی چستی اور زبان و بیان کی دل آویزی کلامِ محرومؔ کی نمایاں خصوصیت ہے، اور اس لحاظ سے یہ مجموعہ واقعی اسم با مسمّی اور اصحاب ذوق کے مطالعہ کے لائق ہے۔

غمِ ہستی ۔ از جناب شاعر بجنوری تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۱۶۰ مجلد مع رنگین گرد پوش، قیمت ۱۲؍ ناشر عبدالستار انصاری، نوری اکیڈمی، الہ آباد۔

یہ چند خطوط پر مشتمل ایک اصلاحی ناول ہے، لائق مصنف کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ آزاد ہندوستان کی تعمیر و ترقی کے لیے ایسے لوگوں کی ضرورت ہے جو ذہنی اور اخلاقی اعتبار سے بہت بلند ہوں لیکن موجودہ تعلیم و تہذیب اور اس کے غلط اور ناقص طریقے مشرق کی قابل قدر روایات اور اخلاق کو ختم اور اخلاقی و روحانی حیثیت سے ملک کو پست اور دیوالیہ بنا رہے ہیں، اس لیے انھوں نے اس میں تہذیب و شرافت کی پامالی کا دردانگیز اور عبرت خیز نقشہ پیش کیا ہے، اور عفیف اور پاکدامن لڑکے اور لڑکی کا کردار بھی دکھایا ہے، ناول اپنے مقصد کے لحاظ سے کامیاب اور کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طلبہ اور طالبات کے لیے خصوصیت کے ساتھ پڑھنے کے لائق ہے،

"م ح"

جلد ۸۵ ماہ ذی الحجہ ۱۳۷۹ھ مطابق ماہ جون ۱۹۶۰ء عدد ۶

مضامین

شذرات

مسلم یونیورسٹی کے بارہ میں جو شکایتیں عرصہ سے سننے میں آتی ہیں ان سے ہم کو نہ ذاتی دلچسپی
ہے اور نہ بحث، لیکن جن شکایتوں کا تعلق یونیورسٹی کے بنیادی مقاصد اور اس کی ملی و تہذیبی خصوصیات
سے ہے ان کے بارہ میں ہم پہلے بھی لکھ چکے ہیں اور آج بھی چند باتیں کہنا ہیں، اس حقیقت سے کسی کو
بھی انکار نہ ہوگا کہ مسلم یونیورسٹی مسلمانوں کا تنہا تعلیمی نہیں بلکہ ملی ادارہ بھی ہے، اور اس کا
مقصد تعلیم کے ساتھ ان کی ملی و تہذیبی روایات کا تحفظ بھی ہے، اس لیے یونیورسٹی میں کسی
ایسی چیز کو گوارا نہیں کیا جا سکتا جو ان مقاصد کے خلاف ہو، یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے
کہ یونیورسٹی کے بہت سے نام نہاد مسلمان اساتذہ کی زندگی اسلامی شعار کے بالکل خلاف ہے،
بلکہ اس کا استخفاف کیا جاتا ہے، یونیورسٹی میں بہت سی ایسی لغو باتیں رائج ہیں جو نہ صرف اسلامی
روایات بلکہ قومی و ملی حمیت کے بھی خلاف ہیں،

یونیورسٹی میں علانیہ الحاد و دہریت کی تبلیغ ہوتی ہے، کمیونسٹوں کا اثر و اقتدار روز بروز
بڑھتا جاتا ہے، بہت سے کمیونسٹ کلیدی جگہوں پر قابض ہیں، اور انھوں نے اپنے اثر و اقتدار
کو کمیونزم کی اشاعت کا ذریعہ بنا لیا ہے، اور وہ یونیورسٹی کو کمیونزم کا گڑھ بنا دینا چاہتے ہیں،
اس کا اعتراف خود کمیونسٹوں کو بھی ہے کہ ان کو سب سے زیادہ کامیابی مسلم یونیورسٹی میں ہوئی ہے،
چنانچہ گذشتہ سال اتر پردیش میں کمیونسٹ پارٹی کی جو کانفرنس ہوئی تھی اس کی روداد مطبوعہ

ٹائمس آف انڈیا میں یہ اعتراف موجود ہے، مسلم یونیورسٹی مسلمانوں کا سب سے بڑا ادارہ ہے، یہیں
مسلمان نوجوانوں کے دل و دماغ کی پرورش ہوتی ہے، اس میں کمیونسٹوں کے اثر و اقتدار کے
معنی یہ ہیں کہ ہماری پوری نسل کمیونزم سے متاثر ہو جائے گی۔

کمیونسٹ نہ صرف مذہب و ملت کے دشمن ہیں بلکہ ملک و وطن کے وفادار بھی نہیں ہیں اور
اور کمیونزم کی قربانگاہ پر ہر چیز کو بھینٹ چڑھا دیتے ہیں، اس لیے جو ادارے کسی مذہب و ملت سے
منسوب اور اس کی روایات کے ترجمان ہوں، ان میں کمیونسٹوں کا اقتدار سراسر ان کے مقاصد
کے خلاف ہے، اس جمہوری دور میں کسی شخص کے خیالات پر تو پابندی نہیں لگائی جا سکتی لیکن
کسی ادارہ سے وابستہ کسی کمیونسٹ کو اس کے مقاصد کے خلاف سرگرمیوں کو اجازت نہیں
دیجا سکتی، یہ کوئی تعصب یا تنگ نظری نہیں بلکہ اصولی بات ہے، کیا کوئی کمیونسٹ ادارہ کسی
غیر کمیونسٹ کو اپنے گھر میں بٹھا کر اس کی تخریب کی اجازت دے سکتا ہے، اگر ایسا نہیں اور یقیناً
نہیں ہے تو پھر مسلم یونیورسٹی میں کمیونسٹ اساتذہ کو نہ صرف اسلام اور مسلمان دشمن بلکہ ملک و
وطن کے خلاف سرگرمیوں کی اجازت کس طرح دیجا سکتی ہے،

غالباً مسلم یونیورسٹی کے دستور میں کوئی دفعہ بھی ایسی موجود ہے جس کی رو سے اس کے اساتذہ
اسلامی روایات اور اسلامی کلچر کے خلاف کوئی کام نہیں کر سکتے، ایسی حالت میں تو ان کو قانوناً بھی
روکا جا سکتا ہے، خیال آتا ہے کہ سر سلیمان مرحوم نے اپنی وائس چانسلری کے زمانہ میں اس قسم کی
پابندی عائد کی تھی، اس وقت بڑے بڑے کمیونسٹوں نے اپنے عقائد سے اظہار برات کیا تھا،
اس لیے آج بھی یہ پابندی عائد کیجا سکتی ہے

ایک جمہوری اور سیکولر حکومت میں اقلیتوں کو اپنی ملّی و تہذیبی خصوصیات برقرار رکھنے اور ان کو فروغ دینے کا پورا حق حاصل ہے، اس لیے مسلم یونیورسٹی کو اس کی خصوصیات کے ساتھ قائم رکھنا ہے، اور حکومت کا یہ فرض ہے کہ وہ بھی اس کام میں پوری امداد دے، یہ ایسی حقیقت ہے کہ ہندوستان کے بڑے بڑے لیڈر اس کا اعتراف کرتے چلے آتے ہیں، ایک زمانہ میں جب جامعہ ملیہ اسلامیہ کی مالی حالت زیادہ خراب تھی تو سیٹھ جمنا لال بجاج یا کسی اور ہندو صاحب ثروت نے اس شرط کے ساتھ مدد دینے کا وعدہ کیا کہ جامعہ ملیہ سے اسلامیہ کا لفظ نکالدیا جائے تو خود گاندھی جی نے اس کی مخالفت کی اور کہا کہ نہ صرف اسلامیہ کا لفظ نہیں نکالا جا سکتا بلکہ جامعہ کو اسلامی افکار و تصورات اور اسلامی تہذیب و روایات کا پورا ترجمان رہنا چاہیے، تاکہ اگر کوئی غیر مسلم اسلامی کلچر کا مطالعہ کرنا چاہے تو جامعہ میں کر سکے، اسی قسم کا خیال سی راجگوپال اچاریہ بھی مسلم یونیورسٹی کے متعلق ظاہر کر چکے ہیں،

کمیونسٹوں کے ہاتھ میں اپنی مدافعت کا ایک بڑا حربہ یہ ہے کہ جہاں کسی نے ان کی مخالفت کی یا اسلام اور مسلمانوں کا نام لیا، فوراً اس کو فرقہ پرستی سے متہم کر دیا، مگر اس قسم کے حربے اب کام نہیں دے سکتے، کمیونسٹوں کی قوم پروری اور وطن دوستی پہلے بھی ظاہر تھی، چین کی جارحیت کے بعد اور بھی بے نقاب ہو گئی ہے، فرقہ پرستی کی تردید کے لیے یہ ثبوت کافی ہے کہ مسلم یونیورسٹی کے ہندو اساتذہ کی بڑی تعداد کمیونسٹوں کی مخالفت میں مسلمان اساتذہ کے ساتھ ہے۔

ہمارے خیال میں اس صورت حال کی اصلاح کی بہتر شکل یہ ہوگی کہ جس طرح یونیورسٹی کے دوسرے معاملات کی تحقیقات کے لیے کمیٹی مقرر کی گئی ہے، اسی طرح ان امور کی تحقیقات کے لیے

بھی ایک کمیٹی مقرر کیجائے جو یونیورسٹی کے بنیادی مقاصد اور اس کی روح کے خلاف یونیورسٹی میں رائج ہیں، یہ کمیٹی ایسے اشخاص پر مشتمل ہونی چاہیے جو قوم کے معتمد علیہ ہوں اور دینی و ملّی حمیت بھی رکھتے ہوں، وہ تحقیقات کر کے رپورٹ اور اصلاح کی تجویزیں پیش کریں، اگر یونیورسٹی کے ارباب حل و عقد ایسا نہیں کرتے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ خود ان کا دامن بھی پاک نہیں ہے، اور ان کی نگاہ میں یونیورسٹی کے بنیادی مقاصد کی کوئی اہمیت نہیں ہے، ہم کو توقع ہے کہ وہ تمام اخبارات اور درد مند مسلمان جو مسلم یونیورسٹی کی خصوصیات کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں، اس مسئلہ میں متحدہ آواز بلند کریں گے۔

الہلال کے ایک مضمون مشہد اکبر کی ملکیت کی بحث نے بہت ناگوار شکل اختیار کر لی تھی اور جب معاملہ اصولی بحث سے ہٹ کر ذاتیات پر آگیا اس وقت ہم نے اس کو ختم کرنے کی درخواست کی مگر اس کا الٹا اثر ہوا اور پہلے سے بھی زیادہ لغو مضامین کا سلسلہ شروع ہو گیا، یہ مضامین ہمارے لیے لایق اعتنا نہیں ہیں، مگر بعض دوستوں کی تحریروں پر جن سے سنجیدگی کی توقع تھی ضرور تعجب ہوا کہ وہ بھی جوش عصبیت میں اس "غوغائے عام" میں شریک ہو کر وہی بولی بولنے لگے، اگر انھوں نے اصل مسئلہ پر بحث کی ہوتی اور اس سلسلہ میں جو مضامین نکلے ہیں، ان کو سامنے رکھکر محاکمہ کیا ہوتا تو ہم کو کوئی شکایت نہ ہوتی، مگر انھوں نے ان سب کو نظر انداز کر کے بالکل نئی اور غیر متعلق بحثیں چھیڑ دیں اور اپنی صحافتی ذہانت و طباعی سے معارف کے ایک ناتمام شذرے کے ایسے ایسے معانی پہنائے اور اپنے نکتہ آفریں دماغ سے مقدمات مرتب کر کے ایسے ایسے نتائج نکالے جو لکھنے والے کے حاشیۂ خیال میں بھی نہ تھے اور اس پر ایک پوری عمارت کھڑی کر دی، اصل بحث سے گریز اور غیر متعلق بحثوں میں الجھنے میں ان کو خاص کمال حاصل ہے، جو ان کی اکثر تحریروں میں نظر آتا ہے، یہی کمال

انھوں نے اس تحریر میں بھی دکھایا ہے، معارف اس فن میں ان کا مقابلہ نہیں کرسکتا، اور علانیہ اعتراف شکست کرتا ہے، ع بیا کہ ما سپر انداختیم گر جنگ است۔

معارف پر فرد جرم لگانے سے پہلے یہ تو دیکھنا چاہیے تھا کہ یہ بحث مدتوں سے چل رہی تھی لیکن معارف نے تعلق رکھنے کے باوجود اس میں کوئی حصہ نہیں لیا، جب وہ حد اعتدال سے گذر کر اس سطح پر آگئی کہ سید صاحبؒ پر حملے شروع ہوگئے، اس وقت معارف کو مجبوراً اس کے خلاف لکھنا پڑا، لیکن اس وقت بھی مولانا ابوالکلام کی عظمت کا دامن اس کے ہاتھ سے نہیں چھوٹا، مگر محض ان کی بعض کتابوں پر تنقید کے اشارے نے وفاداروں کو اتنا چراغ پا کردیا کہ وہ آپے سے باہر ہوگئے۔ ایسی حالت میں اصل مجرم کون ہے اور صنم پرستی کا الزام کس پر عائد ہوتا ہے، الحمد للہ معارف صنم گری اور صنم پرستی کے ہر شائبہ سے پاک ہے۔ یہ جمال ہمنشیں ہمارے وسیع المشرب دوستوں ہی کا حصہ ہے۔

ہمارے لیے یہ بحث نہایت ہی ناپسندیدہ ہے، محض اسے روکنے کے لیے مجبوراً ہم کو اس میں حصہ لینا پڑا، اس کے آئندہ بڑھنے میں اور زیادہ ناگواری پیدا ہونے کا اندیشہ ہے، اس لیے اس تحریر کے بعد اس کو ختم کیا جاتا ہے۔ اور اس کو ختم کرنے کے لیے معارف متنھد اکبر کی ملکیت سے دستبرداری کا اعلان کرتا ہے، بلکہ اگر کوئی اور مضمون سید صاحبؒ اور مولانا ابوالکلام کے درمیان متنازعہ فیہ ہو تو اس سے بھی دست برداری ظاہر کرتا ہے، اگر کسی شخص کا کوئی مضمون کسی دوسرے کی جانب منسوب ہو جائے اور اس سے علم و ادب یا ملک و قوم کو کوئی فائدہ پہنچے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے، اصل چیز افادہ ہے، نام و نسبت نہیں،

مقالات

اجتہاد

از

جناب مولانا محمد تقی صاحب امینی صدر مدرس مدرسہ امینیہ اجمیر

(۲)

تعلیم و تربیت کا انتظام

(د) تعلیم و تربیت کا انتظام:-

قرآن حکیم میں رسول اللہؐ کے اہم مقاصد میں دونوں کا تذکرہ درج ذیل آیت میں ہے،

يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ	وہ رسول اللہ کی آیتیں سناتا ہے، ہر طرح
وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ	کی برائیوں سے انھیں پاک کرتا ہے اور
(۲/۵۸)	کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

ہر قسم کی تعلیم و تربیت کا ایک خاص مزاج ہوتا ہے جس پر گرد و پیش کی دنیا کا بھی لازمی اثر پڑتا ہے، اس لیے اس کے طریقہ کار میں اس مزاج اور اثر دونوں کی رعایت ضروری ہے، ورنہ خاطر خواہ نتیجہ برآمد ہونے کی توقع نہیں،

حفاظت دین کے لیے علم نبوت کی تعلیم دیجاتی ہے، اور تربیت کے ذریعہ زندگی کو کردار نبوت میں ڈھالنے کی کوشش کیجاتی ہے، جن سے زندگی میں عبدیت کی شان پیدا ہو، اور زندہ رہنے کی اہلیت

وصلاحیت نمایاں ہوتی ہے، یہ دونوں چیزیں موجودہ نظام میں جس قدر ابھرتی ہیں وہ اہل بصیرت سے پوشیدہ نہیں ہے۔

تعلیم و تربیت کا نظام مزاج اور ماثر کی رعایت سے مرتب ہونا چاہیے

اگر دینی تعلیم کو جدید نظام تعلیم کے مطابق بالکل اپ ٹو ڈیٹ (up to date) بنا دیا جائے تو مزاج کی رعایت نہ ہوگی، جس کی بنا پر خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہ ہوگا، اسی طرح قدیم نظام اور طریق تعلیم پر جمے رہنے سے گرد و پیش کے اثرات نظر انداز ہو جائیں گے جس سے اس زمانہ میں کوئی اہم دینی خدمت نہ انجام پا سکے گی۔

اس لیے نہ یہ عقلمندی ہے کہ تعلیم کو کل کا ایک غیر مؤثر جزو بنا دیا جائے، طلبا اسکو محض تفریحی پیریڈ کے طور پر استعمال کریں اور نہ ان کی نفسیاتی کیفیت، طبعی صلاحیت اور جدید رجحانات کا لحاظ کیے بغیر مختلف فنون کی کتابوں کو ہمیشہ نصاب میں باقی رکھا جائے، اور سب کو ایک ہی نظام تعلیم میں جکڑنے کی کوشش کیجائے۔

"تربیت" کا طریقہ بھی حالات اور اشخاص کے مزاج کی رعایت سے بدلتا رہتا ہے، ورنہ ایک ہی حال میں ایک ہی طریقہ پر جمے رہنے سے نہ زندگی کے جوہر نمایاں ہوتے ہیں اور نہ جد و جہد کی صلاحیت ابھرتی ہے۔

یہ دونوں چیزیں جس قدر اہم ہیں، بدقسمتی سے ان کی طرف سے اتنی ہی زیادہ غفلت و بے پروائی برتی جاتی ہے، اس لیے اولاً ساری اجتہادی کوششیں انھیں میں صرف کرنے کی ضرورت ہے، اس کے بغیر ساری کوششیں بڑی حد تک غیر مفید اور بے نتیجہ رہیں گی۔

دین کی جد و جہد کا واسطہ تین قسم کے لوگوں سے ہے اس لیے تین قسم کے افراد تیار ہونے چاہئیں

حفاظت دین کے سلسلہ میں دینی جد و جہد کا واسطہ عموماً تین قسم کے طبائع اور ذہنوں سے پڑتا ہے۔ (۱) عوام

(۲) متوسط طبقہ اور (۳) تعلیم یافتہ طبقہ، اس لیے دین کی ترجمانی میں ہر ایک کے مناسب حال طرز تعبیر اور طریقِ استدلال اختیار کرنا چاہیے، جب تک ترجمانی اور تخاطب میں ہر ایک کے ذہن اور طبیعت کا لحاظ نہ کیا جائے گا، کامیابی کی توقع نہیں کیجا سکتی۔

زمانہ کے ساتھ لوگوں کے خیالات و رجحانات اور اس کے مطالبے اور تقاضے بدلتے رہتے ہیں، عمومی حیثیت سے لامذہبی کا دور ہے، مذہب اور لامذہب کا سوال ہے، جو توقعات اور امیدیں لوگوں کو پہلے زمانہ میں مذہب سے وابستہ تھیں، اب وہ لامذہب سے وابستہ ہو گئی ہیں، ایسی حالت میں مذہب کی نمایندگی کا کام آسان کام نہیں ہے، اور اس کے لیے نئی قسم کی صلاحیتوں کی ضرورت ہے۔

مذہبی جد و جہد میں تین قسم کے لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے، اس لیے اس کام کے لیے تین قسم کے افراد تیار ہونے چاہئیں، جن کی ذہنی و طبعی صلاحیتوں کو دیکھ کر ان کی تعلیم و تربیت کا انتظام کیا جائے اور جس طبقہ میں کام کرنے کے وہ اہل ہوں اس کی مناسبت سے ان کی تربیت کی جائے۔

تربیت کا موجودہ طریقہ سود مند نہیں ہے اس میں از سر نو غور کی ضرورت ہے

موجودہ دور میں تعلیم سے زیادہ اہم کام تربیت کا ہے، تربیت کے ذریعہ جن "جراثیم" کو ختم کرنے اور "جن جواہر" کو ابھارنے کی ضرورت ہے، قومی اور جماعتی زندگی کے قیام و بقا کے لیے ان کے بغیر چارہ نہیں ہے۔

پہلے زمانہ میں جبکہ قوم میں زندگی کی صلاحیت تھی، معمولی جد و جہد سے یہ کام انجام پا جاتا تھا، لیکن اب جبکہ قوم بڑی حد تک زوال کی آخری منزل پر پہنچ گئی ہے، اس مسئلہ پر از سر نو غور کرنے کی ضرورت ہے، آج دنیا جس برق رفتاری کے ساتھ آگے بڑھ رہی ہے وہ ہمارے تصور و ادراک سے بھی باہر ہے، مگر اس دنیا میں رہ کر اپنا مقام پیدا کرنا اور دینی کام کو آگے بڑھانا ہے، اسلیے

اس کے طریقۂ کار پر غور کرکے اس کا نظام قائم کرنے کی ضرورت ہے،

(۳) حفاظت نسل کے لیے:-

حفاظت نسل کیلئے عفت وعصمت سے متعلق اخلاقی وقانونی ضابطے ہیں

(۱) وہ تمام اخلاقی وقانونی ضابطے ہیں جن کا تعلق انسان کی عفت وعصمت سے ہے، قرآن حکیم نے زندگی میں بے اعتدالی اور دنیوی غرور اور گھمنڈ کے اثرات ونتائج بیان کرنے کے ذیل میں فرمایا ہے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيُشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰي مَا فِيْ قَلْبِهٖ وَهُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ وَاِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِي الْاَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيْهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ (۲/ ۲۰۲،۱)

بعض وہ آدمی ہیں کہ دنیوی زندگی کے بارے میں ان کی باتیں تمھیں بہت ہی اچھی معلوم ہوتی ہیں اور وہ اپنے ضمیر کی پاکی پر اللہ کو گواہ ٹھہراتے ہیں حالانکہ وہ (نفسیاتی لحاظ سے) دشمنی وخصومت میں بڑے ہی سخت ہیں اور جب انھیں سرداری ملجاتی ہے تو وہ زمین میں خرابی پھیلاتے اور انسان کی کھیتی اور نسل کو ہلاک کرنے کی کوشش کرتے ہیں حالانکہ اللہ اس فساد کو کبھی پسند نہیں (کرتا)۔

الٰہی شریعت نے حفاظت نسل کے لیے عفت وعصمت کے جو اصول مقرر کیے ہیں وہ جدید دنیا اور اس سے مرعوب ذہنوں کے تصور سے بالاتر ہیں، کیونکہ دنیا کا موجودہ نظام "انسان" کے بارے میں جن نظریات وعقائد پر قائم ہے وہ الٰہی نظریات وعقائد سے مطلق مناسبت نہیں رکھتے۔ اصل اختلاف انسان کی حقیقت ہی سے شروع ہوتا ہے، پھر اس کی شان اور مقام کو برقرار رکھنے والے جملہ مسائل میں پھیل جاتا ہے[1]، ایسی صورت میں دنیا کے ہر پیدا ہونے والے سوال

[1] اسکی تفصیلی بحث راقم کی کتاب "عروج وزوال کا الٰہی نظام" میں ملے گی جو ندوۃ المصنفین دہلی سے شائع ہو چکی ہے۔

کا خواہ کتنا ہی غیر اہم ہو، جواز شریعت میں تلاش کرنا اور جس طرح بھی ممکن ہو اس کا حل ڈھونڈھ نکالنا نہایت گمراہ کن طریقہ ہے، درحقیقت غور وفکر کے اصل مستحق وہ مسائل ہوتے ہیں جن پر قوموں اور جماعتوں کا قیام وبقاء موقوف ہوتا ہے، جن کے حل کے بغیر قومی وملی ضرر کا اندیشہ ہو، اس قسم کے مسائل میں اصول تدریج سے کام لے کر رفتہ رفتہ اعتدال پیدا کرنے کی کوشش کیجاتی ہے۔

یہ کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ دنیا کی ہر قوم میں "جواہر" کے ساتھ ساتھ "جراثیم" بھی پیدا ہوتے رہتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان میں یہ "جواہر" ہی مراد ہیں،

الکلمة الحکمة ضالة المومن فحیث وجدها فھو احق بھا (الحدیث)

حکمت کی بات مومن کی گمشدہ متاع ہے، جس جگہ بھی اس کو پائے وہ اسکا زیادہ حقدار ہے،

ان کے جواہر ہی کے قبول کرنے ہی سے قومی زندگی پروان چڑھتی ہے لیکن مرعوب دماغ ان دونوں میں فرق نہیں کرتے اور جواہر کے ساتھ جراثیم بھی قبول کرتے ہیں، ان میں سے جو لوگ مذہب سے اپنا رشتہ منقطع نہیں کرنا چاہتے یا عام مسلمانوں کے خوف سے اپنے نفس اور قوم کو دھوکا دینے کے لیے مذہب کی آڑ میں ان جراثیم کو قبول کرتے ہیں اور مذہب کی ایسی توجیہ کرتے ہیں جس میں یہ جراثیم فٹ ہو جائیں، ان کے نزدیک جہاد کا مفہوم اس قدر وسیع ہوتا ہے کہ ان کے سارے مزعومات اس میں آجاتے ہیں، اور اس کے لیے وہ اسلام کے بنیادی اصولوں کی کانٹ چھانٹ میں بھی دریغ نہیں کرتے،

اسی لیے موجودہ دور کے "متجددین" کی نہ کوئی منزل ہے اور نہ کوئی مقام ہے، بس ان کے نزدیک اجتہاد نام ہے اسلام کی خود ساختہ توجیہ کا اس سے ان کو بحث نہیں کہ اس بارہ میں دور اول میں اسلامی کردار کیا رہا ہے؟ اور اسلامی تعلیمات کے اصل حاملین نے اسکی کیا توجیہ کی ہے۔

فواحش وبدکاری کی راہوں پر پابندیاں

(ب) فواحش وبدکاری کی تمام راہوں پر پابندیاں لگائی گئی ہیں، نفس اور عقل کے تقاضوں میں توازن قائم رکھتے ہوئے ایک طرف دوسروں کی عزت وناموس کی حفاظت کا مکمل انتظام کیا گیا ہے، دوسری طرف نفسانی خواہشات کی تکمیل کی ایک حد مقرر، اور اس کے محل کی تعیین کی گئی ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک جامع اصول کے ذریعہ زندگی کا یہ معیار مقرر فرمایا ہے،

لا یومن احدکم حتی یحب	آدمی پورا مومن اسوقت تک نہیں ہوسکتا
لاخیہ ما یحب لنفسہ	جب تک اسکی نفسی ومزاجی کیفیت یہ نہ ہوجائے کہ
	دوسرے کے لیے وہی پسند کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے

اخلاقیات میں موجودہ دنیا کی پسندیدگی وناپسندیدگی کا معیار بدل گیا ہے، اس کا نتیجہ ہے کہ عزت وناموس اور حفاظتِ نسل کی اہمیت دن بدن گھٹتی جارہی ہے، اور ایک طبقہ کے نزدیک تو تقریباً ختم ہوچکی ہے، ایسی حالت میں مذکورہ حدیث میں ایمانی زاویۂ نگاہ اور ایمان والی زندگی ہی کا معیار مراد ہوگا،

ان کی خلاف ورزی کی تعزیرات اور سزائیں

(ج) مقررہ حدود وقیود کی خلاف ورزی کی صورت میں شریعت نے اخروی عذاب کی وعید کے ساتھ دنیاوی تعزیرات وحدود بھی مقرر کیے ہیں کہ اس کے بغیر صالح معاشرہ وجود میں نہیں آسکتا.

شریعت نے حفاظت نسل کے لیے عفت وپاکدامنی کا معیار اتنا بلند کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

لا یزنی الزانی حین یزنی	کوئی بدکار ایمان کی حالت میں بدکاری
وھو مومن [1]	کرہی نہیں سکتا ہے.

[1] بخاری ومسلم

دوسرا ارشاد ہے

العینان زناھما النظر والاذنان	آنکھوں کا زنا دیکھنا، کانوں کا زنا سننا،
زناھما الاستماع واللسان	زبان کا زنا بات چیت کرنا، ہاتھ کا زنا پکڑنا
زناہ الکلام والید زناھا	اور پاؤں کا زنا چلنا ہے،
البطش والرجل زناھا الخطی	

پھر ان چیزوں پر پابندی لگائی گئی جو نفسیاتی خواہشات کو برانگیختہ کرنے والی ہیں، اس سلسلہ میں شریعت نے بتدریج ان تمام چیزوں کے ختم کرنے یا ان کا استعمال بدل دینے کا حکم دیا جن سے اس فعل میں مدد ملتی ہے،

دنیا میں "خیر" کے ساتھ "شر" کا وجود بھی ناگزیر ہے اور اشیا میں نفع کے ساتھ نقصان سے بھی انکار نہیں ہوسکتا ہے کہ اکثر چیزیں اپنی پیدایش کے لحاظ سے بہمہ وجوہ بری نہیں ہوتی ہیں، بلکہ اس میں شر اور نقصان کے ساتھ خیر اور نفع کا پہلو بھی ہوتا ہے، اس لیے اصل چیز اس کا طریق استعمال ہے، اور خیر وشر کا فیصلہ غلبہ کے اعتبار سے کیا جاتا ہے، اور ان ہی دونوں بنیادوں کو پیش نظر رکھنے سے صالح معاشرہ کی تکمیل ہوتی ہے،

تعزیر کے درجہ میں وسعت

شریعت نے "حفاظت نسل" کے قوانین کی خلاف ورزی کی صورت میں جو سزائیں مقرر کی ہیں، ان میں موقع ومحل کے لحاظ سے وسعت سے کام لیا ہے، کیونکہ تعزیری طور پر جو سزائیں دی جاتی ہیں ان میں بالعموم وسعت کا لحاظ ناگزیر ہوتا ہے. چنانچہ فقہاء کہتے ہیں

وان رأی الامام ان یضم الی الضرب	حکومت اگر مناسب سمجھے تو "تعزیر" میں مار
فی التعزیر الحبس فعل (ہدایہ اولین ص ۵۱۴)	کے ساتھ قید بھی کرسکتی ہے،

حد کے مرحلہ میں سختی کا حکم ہے

لیکن جب معاملہ کی نوعیت حد (مقررہ سزا) کے مرحلہ تک پہنچ جائے اور معاشرہ بھی اسکا متحمل بن گیا ہو تو پھر مجرم کے ساتھ نہ رعایت کی گنجائش ہے اور نہ حکومت حد کے نفاذ میں لیت ولعل کی مجاز ہے، البتہ حد کے بھی درجے اور مرتبے ہیں، مثلاً ایک درجہ کا حکم قرآن میں ہے

وَالّٰتِیْ یَاْتِیْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَآئِكُمْ فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَيْهِنَّ اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ فَاِنْ شَهِدُوْا فَاَمْسِكُوْهُنَّ فِي الْبُيُوْتِ حَتّٰى يَتَوَفّٰهُنَّ الْمَوْتُ اَوْ يَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِيْلًا [illegible]	جو عورتیں بدچلنی کی مرتکب ہوں تو چاہیے کہ چار آدمیوں کی اس پر گواہی لو، اگر چار گواہ گواہی دیدیں تو پھر ایسی عورتوں کو گھروں میں بند رکھو یہاں تک کہ موت ان کی عمر پوری کردے یا اللہ ان کے لیے دوسری راہ پیدا کرے،

مطلب یہ ہے کہ عمر قید کی سزا دو، اور یہ حکم اس وقت تک کے لیے ہے جب تک معاشرتی حالت دوسرے درجہ کے حکم کی متحمل نہ بن جائے، "اَوْ يَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِيْلًا" سے یہی مراد ہے، ورنہ ایک ساتھ جملہ احکام کے نازل کردینے میں کیا دشواری تھی،

ظاہر ہے کہ جو عورت بےحیائی کی اس منزل پر پہنچ چکی ہو کہ اس کی بدچلنی پر علانیہ شہادتیں گذر سکتی ہوں اس کی سزا مکمل "نظربندی" کے سوا اور کچھ ہو ہی نہیں سکتی ہے،

اسی سلسلہ کی دوسری آیت یہ ہے:

وَالَّذٰنِ یَاْتِیٰنِهَا مِنْكُمْ فَاٰذُوْهُمَا فَاِنْ تَابَا وَاَصْلَحَا فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمَا [illegible]	جو دو شخص تم میں سے بدچلنی کے مرتکب ہوں تو انکو اسکی پوری سزا دو کہ وہ اسکی اذیت محسوس کرنے لگیں، پھر اگر وہ دونوں توبہ کرلیں اور اپنی [illegible]

[illegible]

یعنی اصلاح حال کی امید کے بعد عمر قید کی سزا، میں تخفیف کی گنجائش ہے، ان سزاؤں میں موقع و محل کے لحاظ سے بدچلنی (بدکاری) کی کئی صورتیں شامل ہوسکتی ہیں، نیز اس میں (ایام قید میں) تربیت کا پہلو بھی پوشیدہ ہے، ورنہ "تابا واصلحا" کا کوئی محل نہ رہے گا، اور مرد کے معاملہ میں سزا پر زیادہ زور ہے، اور عورت کے بارے میں قید پر زیادہ زور ہے، کہ وہ سزا کی متحمل نہیں ہوسکتی ہے،

دوسرے درجہ کا حکم یہ ہے:

دوسرے قسم کے حد

اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ وَّلَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَائِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ [illegible]	زانی اور زانیہ ہر ایک کو سو سو کوڑے مارو ان دونوں پر اللہ کا قانون نافذ کرنے میں رحم اور مہربانی نہ حائل ہونا چاہیے اگر تم اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہو، اور سزا دیتے وقت مومنوں کا ایک مجمع موجود ہونا چاہیے۔

یہ سزا کنوارے غیر شادی شدہ کے لیے ہے، اس کے ثبوت اور نفاذ کے لیے نہایت کڑی شرطیں مقرر ہیں، ان کے بغیر یہ حد (سزا) جاری نہیں ہوسکتی ہے، یہ بھی ضروری ہے کہ سزا مجمع کے سامنے دیجائے تاکہ دوسرے لوگوں کو عبرت اور سبق حاصل ہو،

شادی شدہ مجرم کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حکم فرمایا ہے

ان ماعزا اتی النبی صلی اللہ علیہ وسلم فاقر عندہ اربع مرات فامر برجمہ (ابوداؤد از مشکوٰۃ)	ماعز (ایک شخص کا نام) رسول اللہ کے پاس آیا اور چار مرتبہ اقرار کیا تو آپ نے رجم کا حکم دیا،

"رجم" مجرم پر پتھراؤ کرنے کو کہتے ہیں (اس کی تفصیل آگے آرہی ہے) رجم کا ثبوت مختلف حدیثوں سے ملتا ہے، اگرچہ ان میں اختلاف بھی ہے، مگر بڑی حد تک تطبیق کی صورتیں بھی بیان کی گئی ہیں، البتہ رجم کے سلسلہ میں جو آیت "منسوخ التلاوۃ" کہی جاتی ہے اگر اس کو صحیح تسلیم کرلیں (گو اس سے سنگین اعتراض کا دروازہ کھلتا ہے) اور اس سے رجم کا ثبوت مانیں تو پھر اس حکم کو منسوخ ماننا ہی پڑے گا، کیونکہ ایک حکم نازل ہونے کے بعد پھر اس کو اس قدر منسوخ قرار دیدینا کہ تلاوت کی بھی اجازت نہ باقی رہے جبکہ دوسری منسوخ آیتیں تلاوت کیجاتی ہیں، اسی صورت میں ہوسکتا ہے کہ قطعی طور پر اس کو بنیاد سے ختم کرنا مقصود ہو، اگر یہ مانا جائے کہ آیت رجم کی تلاوت گو منسوخ ہوگئی مگر اس کا حکم باقی ہے تو اس سے بہت سی غلط فہمیوں کا دروازہ کھلتا ہے، اس موقع پر اس کی تحقیق اور اس پر تفصیلی بحث مقصود نہیں ہے، اس موضوع پر بہت سے اصحاب علم و قلم لکھ چکے ہیں اس لیے اس کی ضرورت بھی باقی نہیں ہے، یہاں صرف حکم بیان کرنا مقصود ہے۔

اس جرم کے ثبوت کے لیے فقہا نے بڑی کڑی شرطیں رکھی ہیں، جن کی تفصیل فقہ کی کتابوں میں مذکور ہے، اگر ان کے بعد بھی جرم ثابت ہوجائے تو پھر شریعت نے کنوارے اور شادی شدہ مجرم کے لیے مذکورہ دو سزائیں مقرر کی ہیں، جو بظاہر سخت معلوم ہوتی ہیں، لیکن یہ سختی موجودہ ماحول اور مزاج کے اعتبار سے ہے، جس میں جرم کی پرورش ہوتی ہے، ورنہ جن لوگوں کے سامنے صالح معاشرہ کا تخیل ہے اور اس فعل کے اجتماعی زندگی میں مضر اثرات ہیں ان کے نزدیک یہ سختی سختی نہیں ہے، بلکہ صحت کی بحالی کے لیے ناگزیر طور پر کڑوی دوا کا استعمال ہے کہ اس کے بغیر معاشرہ نہ صحت مند ہوسکتا ہے اور نہ ہی وہ صحت کو برقرار رکھ سکتا ہے،

بعض ترقی یافتہ ممالک میں بعض جرائم کی اس سے زیادہ سخت سزا دیجاتی ہیں، مثلاً

بغاوت اور خفیہ خبر رسانی کی سزا بجلی کے کرنٹ کے ذریعہ اس طرح دیجاتی ہے کہ مجرم تڑپ تڑپ کر رہتا ہے اور جان نہیں نکلتی ہے،

اس قسم کی سخت سزاؤں سے ایک طرف تو فعل کی شناعت و خباثت ذہن نشین ہوتی رہتی ہے، دوسری طرف ارتکاب کی ہمت نہیں ہوتی ہے، جس حکومت اور معاشرت میں بر رضا و رغبت عزت و ناموس پر حملہ جرم ہی نہ قرار پائے اس میں ظاہر ہے کہ نہ حفاظت نسل کی اہمیت باقی رہے گی نہ عزت و ناموس کی حفاظت کی کوئی ضمانت ہوگی،

نکاح، طلاق، نسب وغیرہ کے مسائل

(د) نکاح، طلاق، خلع، عدت، نسب وغیرہ کے مسائل

قرآن حکیم میں ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا يَحِلُّ لَكُمْ أَنْ تَرِثُوا النِّسَاءَ كَرْهًا وَلَا تَعْضُلُوهُنَّ لِتَذْهَبُوا بِبَعْضِ مَا آتَيْتُمُوهُنَّ إِلَّا أَنْ يَأْتِينَ بِفَاحِشَةٍ مُبَيِّنَةٍ وَعَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ فَإِنْ كَرِهْتُمُوهُنَّ فَعَسَىٰ أَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا وَيَجْعَلَ اللَّهُ فِيهِ خَيْرًا كَثِيرًا (۴/۲۳)

اے ایمان والو! تمھارے لیے یہ بات جائز نہیں کہ عورتوں کو میت کی میراث سمجھ کر ان پر زبردستی قبضہ کرلو، اور نہ ایسا کرنا چاہیے کہ جو کچھ مال و متاع انھیں دے چکے ہو اس میں سے کچھ لے نکلنے کے لیے ان پر سختی کرو اور انھیں روک رکھو، الا یہ کہ وہ علانیہ بد چلنی کی مرتکب ہوئی ہوں، اور دیکھو عورتوں کے ساتھ معاشرت کرنے میں نیکی و انصاف ملحوظ رکھو، پھر اگر ایسا ہو کہ تمھیں کسی وجہ سے وہ ناپسند ہوں تو بے ضبط اور بے قابو نہ ہوجاؤ، عجب نہیں کہ ایک بات تم ناپسند کرتے ہو اور اسی میں اللہ نے

آگے کی آیتیں اس سے بھی زیادہ حسن سلوک پر دلالت کرتی ہیں ،

وَإِنْ أَرَدْتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ وَآتَيْتُمْ إِحْدَاهُنَّ قِنطَارًا فَلَا تَأْخُذُوا مِنْهُ شَيْئًا أَتَأْخُذُونَهُ بُهْتَانًا وَإِثْمًا مُّبِينًا وَكَيْفَ تَأْخُذُونَهُ وَقَدْ أَفْضَىٰ بَعْضُكُمْ إِلَىٰ بَعْضٍ وَأَخَذْنَ مِنكُم مِّيثَاقًا غَلِيظًا (۴/۲۶)

اگر تم حسن معاشرت کے ساتھ نباہ نہ کر سکو اور ارادہ کر لو کہ ایک بیوی کو چھوڑ کر اسکی جگہ دوسری کر دگے اور پہلی بیوی کو تم نے چاندی سونے کا ایک ڈھیر بھی مہر میں دیدیا ہو تو بھی نہیں چاہیے کہ اسے علیحدہ کرتے ہوئے اس میں سے کچھ واپس لے لو کیا تم چاہتے ہو کہ اپنا دیا ہوا مال بہتان لگا کر اور ظلم و تعدی کر کے واپس لے لو۔

طلاق کے سلسلہ میں ہے:

فَإِمْسَاكٌ بِمَعْرُوفٍ أَوْ تَسْرِيحٌ بِإِحْسَانٍ وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ أَن تَأْخُذُوا مِمَّا آتَيْتُمُوهُنَّ شَيْئًا إِلَّا أَن يُقِيمَا حُدُودَ اللَّهِ (۲/۲۲۹)

طلاق رجعی کے بعد دو ہی راستے رہ جاتے ہیں، یا تو اچھے طریقہ پر روک لینا ہے یا پھر حسن سلوک کے ساتھ الگ کر دینا ہے، اور تمھارے لیے جائز نہیں ہے کہ جو کچھ اپنی بیویوں کو دے چکے ہو اس میں سے کچھ واپس لے لو۔

"خلع" کے بارے میں ہے:

فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا يُقِيمَا حُدُودَ اللَّهِ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيمَا افْتَدَتْ بِهِ (۲/۲۲۹)

اگر تم دیکھو کہ ایسی صورتیں پیدا ہو گئی ہیں اور واقعی اندیشہ ہے کہ اللہ کے ٹھہرائے ہوئے واجبات و حقوق ادا نہ ہو سکیں گے

تو پھر شوہر اور بیوی کے لیے اس میں کچھ گناہ نہ ہوگا اگر بیوی اپنا پیچھا چھڑانے کیلئے بطور معاوضہ کے اپنے حق میں سے کچھ دیدے اور شوہر اسے لیکر علیحدگی پر راضی ہو جائے،

عدت کے بارے میں ہے

وَأَحْصُوا الْعِدَّةَ وَاتَّقُوا اللَّهَ رَبَّكُمْ

اور عدت کی حفاظت کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو جو کہ تمھارا پروردگار ہے۔

"نسب" کے سلسلہ میں ہے:

وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ أَن يَكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللَّهُ فِي أَرْحَامِهِنَّ إِن كُنَّ يُؤْمِنَّ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ (۲/۲۲۸)

اگر وہ اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتی ہیں تو ان کے لیے جائز نہیں ہے کہ جو چیز اللہ نے انکے شکم میں پیدا کر دی ہو اسے چھپائیں کہ اس سے عدت میں خلل ہوگا اور نسب غیر محفوظ ہو جائیگا۔

شریعت نے ان میں ہر ایک سے متعلق تفصیلی احکام بیان کیے ہیں اور جگہ جگہ حدود و قیود کی پابندی کی تاکید کی ہے، مثلاً تلك حدود الله فلا تقربوها (یہ اللہ کی حدیں ہیں ان کے قریب نہ جاؤ) تلك حدود الله فلا تعتدوها (یہ اللہ کی حدیں ہیں، ان سے تجاوز نہ کرو) وغیرہ

صنف نازک کا مسئلہ اور اسلامی شریعت

صنف نازک کا مسئلہ تاریخ کے ہر دور میں بڑا نازک رہا ہے اور دنیا نے اکثر اس کے ساتھ بے انصافی کی ہے، افلاطون تک نے اس کو مشترک ملک قرار دیا ہے،[1] مذہب کی بگڑی ہوئی شکلوں اور اس کے نمائندوں نے بھی اس کے

[1] ملاحظہ ہو جمہوریہ افلاطون

ساتھ کچھ اچھا سلوک نہیں کیا ہے، خواہ یہ زمانہ کی ستم ظریفی ہو یا عورت کی فطری کمزوری کا نتیجہ کہ ہر دور میں اس کی قسمت کا فیصلہ مردوں کے ہاتھ میں رہا ہے، اور وہی اپنے خود غرضانہ اور نفس پرستانہ جذبات کے مطابق اس سے متعلق جملہ مسائل طے کرتے رہے ہیں، اسی کا یہ ردعمل ہے کہ اب وہ آزاد ہو کر اپنا اصلی مقام بھی چھوڑنے پر آمادہ ہے، اور تمام حدود و قیود سے بے نیاز ہو کر نیا مقام تلاش کرنے میں سرگرداں ہے، لیکن اس میں بھی اس کے رہنما مرد ہی ہیں، اس لیے توقع نہیں کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو،

لیکن الٰہی شریعت نے اسکی مستقل حیثیت تسلیم کی ہے اور دو زندگیوں کو ملا کر ایک زندگی قرار دی ہے، اور جو ذمہ داریاں اس کے سپرد کیں اور جو مقام اس کو عطا فرمایا ہے، اس میں اسکی فطری ساخت کا اعتبار کیا ہے، نہ کہ مردوں کے خود غرضانہ جذبات کا، فطری نقشہ میں جو لکیریں مشترک تھیں، ان میں دونوں کا یکساں لحاظ کیا گیا ہے، اور جو الگ الگ تھیں ان میں کچھ امتیاز ہے، اس بنا پر کچھ باتیں دونوں میں مشترک قرار پائیں اور کچھ دونوں کے لیے الگ الگ مخصوص ہیں، مگر زندگی کی تکمیل کے لیے دونوں کی یکساں ضرورت ہے اور دونوں ایک دوسرے کے محتاج ہیں، ان دونوں کی انفرادیت اور اشتراک کو ملحوظ رکھکر شریعت نے جو آمیزہ تیار کیا ہے، درحقیقت اسی سے زندگی خوشگوار بنتی ہے، صنف نازک اپنی انفرادی خصوصیات کی بنا پر ہمہ وقت اس قابل نہیں رہتی ہے کہ زندگی کی جد و جہد کی متحمل بن سکے، اس بنا پر دونوں کے کام کے دائرے اور اس کی راہوں میں فرق کرنا ناگزیر تھا، اس لیے شریعت نے ہر ایک کی طبعی مناسبت کا لحاظ کر کے ان کے دائروں اور کام کی راہوں میں فرق کیا ہے، مگر اس سے ان کے حقوق پر کوئی اثر نہیں پڑتا ہے، قرآن مجید ایک دوسرے پر حقوق میں دونوں کو برابر قرار دیتا ہے،

وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ (۲/۲۲۸)	عورتوں کے لیے بھی اسی طرح کے حقوق مردوں پر ہیں جس طرح کے حقوق مردوں کے عورتوں پر ہیں۔

فقہاء نے عورتوں سے متعلق احکام پر تفصیلی بحث کی ہے، ان میں سے بعض بحثیں موجودہ حالات کے پیش نظر دشوار گذار بنگئی ہیں، اور بعض کی ضرورت باقی نہیں رہ گئی ہے، ان میں فقہاء کے اختلاف بھی مذکور ہیں، جو بڑی حد تک حالات و مقامات اور زاویۂ نگاہ کی تبدیلی پر مبنی ہیں، ان سب سے مستفید ہونے، ان کی دشواریوں پر قابو پانے اور بعض مسائل پر از سر نو غور و خوض کی ضرورت ہے،

(۴) حفاظت عقل کے لیے:-

حفاظت عقل کے لیے نشہ آور چیزوں پر پابندی،

(۱) تمام نشہ آور چیزوں کے استعمال پر پابندی لگائی گئی ہے اور اس پابندی میں اصول تدریج سے کام لیا گیا ہے، مثلاً ابتدائی مرحلہ کا یہ حکم تھا:

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا (۲/۲۱۷)	اے پیغمبر تم سے لوگ شراب اور جوے کے بارے میں پوچھتے ہیں، ان سے کہہ دو ان دونوں چیزوں میں نقصان بہت ہے اور انسان کے لیے فائدے بھی ہیں لیکن ان کا نقصان فائدہ سے بہت زیادہ ہے

اس آیت میں شراب اور جوے کے نفع و نقصان کے بارے میں یہ اصولی حقیقت بیان کی گئی ہے کہ چیزوں میں صرف نفع ہی نہ دیکھنا چاہیے کیونکہ کوئی چیز بھی کسی نہ کسی حیثیت سے نفع سے خالی نہیں ہوتی ہے، بلکہ نفع اور نقصان دونوں پر نظر ڈالنی چاہیے جس چیز میں نقصان زیادہ ہو اسے ترک کر دینا چاہیے، خواہ تھوڑا بہت نفع بھی حاصل ہوتا ہو اور جس چیز میں نفع زیادہ ہو اسے اختیار کرنا چاہیے خواہ اس میں تھوڑے سے نقصان کا بھی اندیشہ ہو،

قدیم زمانہ میں اور اب بھی یہ خیال کیا جاتا ہے کہ شراب سے جنگ کرنے میں مدد ملتی ہے،

اور جو احصول ،ال کا ذریعہ ہے ، اس بارہ میں مذکورۂ بالا آیت میں ایک اصولی حقیقت بیان کرکے اس غلطی کا ازالہ کیا گیا ہے ، دوسرے مرحلہ کا حکم یہ ہے ،

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقْرَبُوا الصَّلَاةَ وَأَنْتُمْ سُكَارَىٰ حَتَّىٰ تَعْلَمُوا مَا تَقُولُونَ (۴۳/۴)

اے ایمان والو، ایسا کبھی نہ کرو کہ تم نشہ میں ہو اور نماز کا ارادہ کرو، نماز کے لیے ضروری ہے کہ تم ایسی حالت میں ہو کہ جو کچھ زبان سے کہو ٹھیک طور پر اسے سمجھو،

اس سے نماز کے اوقات میں شراب پینے کی ممانعت کی گئی ، تیسرے مرحلہ میں بالکلیہ ممانعت کا قانون نازل ہوا ہے ،

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنْصَابُ وَالْأَزْلَامُ رِجْسٌ مِنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ

اے ایمان والو، شراب ، جوا اور بت گندی چیزیں ہیں ، ان کا تعلق شیطانی حرکات سے ہے ، اس لیے تم پرہیز کرو تاکہ فلاح پاؤ ،

خلاف ورزی کی صورت میں سزائیں

(ب) اس حکم کی خلاف ورزی کی سزائیں مقرر کی گئی ہیں ، مگر ابتدائی تعزیر کے درجہ میں وسعت رکھی گئی ہے ، کیونکہ اشخاص و احوال کے لحاظ سے سزا میں تفاوت ناگزیر ہے ، اسی بنا پر اس بارہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے مختلف طرز عمل منقول ہیں،[1]

لیکن صورت حال جب "حد" کے درجہ تک پہنچ جائے تو اس کی سزا اسی کوڑے مقرر ہے ، چنانچہ فقہ میں ہے:

[1] ملاحظہ ہو کتب احادیث

وحد الخمر والسكر في الحر ثمانون سوطا للاجماع الصحابة[1]

شراب اور نشہ کی سزا اسی کوڑے ہیں ، یہ صحابہ کے اتفاق سے ثابت ہے ،

مگر عادی مجرم کے لیے اس سزا میں بھی تبدیلی کی گنجائش ہے ، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مجرم کے متعلق جو تین مرتبہ اس جرم میں ماخوذ ہو چکا تھا ، فرمایا:

فان اعاد في الرابعة فاقتلوه[2]

اور اگر چوتھی مرتبہ بھی لایا جائے تو اسکو قتل کردو

مگر اس سے مقصود "سختی" ہے قتل نہیں ، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دوسرے شخص کو جو چوتھی مرتبہ شراب نوشی میں ماخوذ ہوا تھا قتل کی سزا نہیں دی

ثم اتي النبي صلى الله عليه وسلم بعد ذالك برجل قد شرب في الرابعة فضربه ولم يقتله[3]

پھر ایک شخص حضورؐ کی عدالت میں لایا گیا جس نے چوتھی مرتبہ شراب پی تھی آپ نے اس کو مار کی سزا دی اور قتل نہیں کیا ،

جس سے ثابت ہوتا ہے کہ مقررہ سختی میں بھی مزید سختی کی گنجائش ہے ، مگر فقہا نے ثبوت جرم اور حد کے نفاذ کے لیے جو شرطیں مقرر کی ہیں ان کے پائے جانے کے بعد ہی حد کا اجراء ہوگا ، اس کی تفصیلات فقہ کی کتابوں میں مذکور ہیں ،

موجودہ دور میں شراب نوشی فیشن بن گئی ہے اور ترقی کی علامت سمجھی جانے لگی ہے ، لیکن کسی برائی کے عام ہو جانے سے نہ اس کی برائی میں کمی پیدا ہوتی ہے اور نہ اس کے مضر اثرات سے ہی بچاؤ ہوتا ہے ، تقریباً چودہ سو سال پہلے "شارع" نے شراب کو "ام الخبائث" قرار دیا ہے ، اس کے نفسیاتی اثرات کا مشاہدہ پہلے سے زیادہ آج ہو رہا ہے۔

یہ عجیب بات ہے کہ ہر دور میں اس کو طبی اور اخلاقی نقطۂ نگاہ سے نہایت مضر تسلیم

[1] ہدایہ اولین ص ۵۰۶ [2] ترمذی وغیرہ [3] ایضاً

کیا گیا ہے، اسی بنا پر حکومتیں اس کے رواج کو کم کرنے کے لیے برابر کوشش کرتی رہی ہیں پھر بھی اس میں کامیابی نہیں ہو سکی ہے، اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ قانون کے نفاذ اور معاشرہ کے سدھار کے لیے جس قسم کا طریق کار درکار ہے اس پر موجودہ حکومتیں عمل نہیں کرتی ہیں، یا تو ان میں ہی اہلیت نہیں ہوتی ہے اور یا وہ ایمانداری کے ساتھ کرنا نہیں چاہتی ہیں،

ایک مریض جس کے "اعضاء رئیسہ" پر شدید قسم کی ایسی ضربیں پڑی ہوں جس سے وہ ماؤف ہو گئے ہوں اور ان کے کام کی رفتار میں فرق آگیا ہو اس کو محض ضابطہ کی خانہ پری سے نہیں بلکہ مکمل علاج ہی سے فائدہ ہوگا، اس لیے جب تک معاشرہ کی اصلاح نہ ہو اس وقت تک محض قانونی بندش زیادہ فائدہ نہیں دے سکتی،

برائیوں اور بد عادتوں سے بچنے کی ہدایت

(ج) ان تمام برائیوں اور عادتوں سے روکا گیا جن کا اثر نفسیاتی لحاظ سے قلب و دماغ پر پڑتا ہے، قرآن مجید کی اس آیت میں اسی طرف اشارہ ہے:

لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا — ان کے پاس دل ہیں مگر تفقہ سے خالی ہیں،
وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا — آنکھیں ہیں مگر دیکھتے نہیں ہیں، کان ہیں
وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا (اعراف) — مگر سنتے نہیں ہیں۔

جس طرح انسان کے اقوال و افعال کا اثر ظاہری اعضاء پر بھی پڑتا ہے، اس سے کہیں زیادہ باطنی اعضاء متاثر ہوتے ہیں، کن کن چیزوں سے کس کس طرح وہ اثر قبول کرتے ہیں، یہ بحث نہایت دقیق ہے، اور قلب و دماغ کی ذکاوت اور اثر پذیری کا مطالعہ کرنے کے لیے علمی تحقیقات کافی نہیں ہیں، بلکہ "معروف اور منکر" کی تحلیل اور اس کے نفسیاتی تجربہ کی بھی ضرورت ہے جو حکمت ایمانی کے بغیر ممکن نہیں ہیں۔

تعلیم و تربیت پر زور

(د) تعلیم و تربیت پر زور دیا گیا ہے، جس سے عقل کی فطری صلاحیتیں بیدار ہوں اور اچھائیوں اور اچھی عادتوں کے ذریعہ ان میں جلا پیدا ہوتی رہے، قرآن حکیم کی سب سے پہلی آیت میں ان دونوں کا تذکرہ ہے،

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ — پڑھیے اپنے رب کے نام کے ساتھ جس نے پیدا کیا،
خَلَقَ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ — اس نے انسان کو جمے ہوئے لہو سے پیدا کیا، پڑھیے
اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ الَّذِيْ — اور آپ کا پروردگار بہت کرم کرنے والا ہے
عَلَّمَ بِالْقَلَمِ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ — جس نے قلم کے ساتھ سکھایا انسان کو سکھایا
مَا لَمْ يَعْلَمْ (۹۶) — جو کچھ وہ نہیں جانتا تھا۔

اس آیت میں انسان کی پیدائش اور علم دونوں کا ایک ساتھ ذکر کرنے سے اس بات کی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ انسانیت کے اصل جوہر علم سے جس میں تربیت بھی شامل ہے نمودار ہو سکتے ہیں، اس کے بغیر اس کی حیوانی جبلت کی اصلاح نہیں ہو سکتی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقع پر فرمایا:

الناس معادن کمعادن الذہب — لوگ سونے اور چاندی کے کانوں کے مثل
والفضۃ خیارھم فی الجاھلیۃ — ہیں جو زمانہ جاہلیت میں اچھے تھے وہ
خیارھم فی الاسلام اذا — اسلام میں بھی اچھے ہیں، بشرطیکہ وہ تفقہ
فقھوا (الحدیث) — حاصل کریں،

"تفقہ" تعلیم و تربیت دونوں کو شامل ہے اور حدیث میں خراب اثرات دور کرنے اور اچھے کو پائدار بنانے میں ان دونوں کے کردار کی طرف اشارہ ہے،

(باقی)

مرزا مظہر جان جاناں کی فارسی شاعری

از

جناب عبد الرزاق صاحب قریشی اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بمبئی

شاعری اور پریشاں نظری خود مرزا صاحب کے قول کے مطابق ان کے ضمیر میں تھی[1]، اپنے فارسی دیوان کے دیباچہ میں انھوں نے لکھا ہے کہ "فقیر در ہنگام جوانی تحریک شور عشقی کہ نمک خمیرش بود نالہ ہائے موزوں می کرد[2]"۔ لیکن جب ہنگام جوانی ختم ہوگیا، تحریک شور عشقی سرد پڑ گئی، سلوک کی منزلیں طے ہونے لگیں اور حجابات اٹھنے لگے تو شعر گوئی سے دلچسپی اگر جاتی نہیں رہی تو کم ضرور ہوگئی، خود مرزا صاحب کا بیان ہے کہ

چوں بسلسلۂ حضرات نقشبندیہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین منسلک و متلزم شدم آں قدر مغلوب حال خود گشتم کہ آن کیفیات تماما از دل مسلوب گشت و اصلا در خود طاقت حرکت خلاف اتباعِ سنت نماند و اثری کہ از طینت باقی بود خط در انشاء اشعار بر داشت و حالا بحکم حضرات مشائخ قدس اللہ سرہم از مدت سی سال در ارشاد طالبان و تعلیم و تربیت یاران مشغولم[3]"۔

میر تقی میر نہ صرف یہ کہ مرزا صاحب کے ہم عصر تھے، بلکہ ان کی خدمت میں انھیں نیاز بھی حاصل تھا،

[1] مولوی نعیم اللہ بہرائچی: معمولات مظہریہ ص ۷، [2] مرزا مظہر: دیوان مرزا مظہر جان جاناں: دیباچہ ص ۲
[3] مولوی نعیم اللہ بہرائچی: معمولات مظہریہ ص ۱۲، ۱۳

ان کے بیان سے بھی یہی پتا چلتا ہے کہ نکات الشعرا کی تحریر کے وقت (۱۱۶۵ھ) مرزا صاحب کو شعر و شاعری سے کچھ زیادہ دلچسپی باقی نہیں رہ گئی تھی، مرزا صاحب لکھتے ہیں کہ

"اکثر اوقات در یاد الٰہی صرف می کند ..... اگر چہ شعر گفتن دون مرتبۂ اوست گاہی متوجہ این فن بی حاصل می شود[1]"۔

فتح علی گردیزی بھی مرزا صاحب کے ہم عصر و ہم مشرب تھے اور دہلی میں رہتے تھے، اس لیے ان کا بیان بھی "عینی شاہد کے بیان کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ

"سرش از بلند ہمتی بشعر و شاعری فرو نمی آید و این مشغلہ ہا را سرمایۂ افتخار نمی انگارد..... لیکن چوں عشق سخن سر رشتۂ آب و گلش ہست و مہر معنی جاگزین دلش از فرط استیلائے عشق معنی ہر گاہ از صحبت صوفیان خانقاہ و مستفیدان خدا خواہ فرصتش دست بہم می دہد متوجہ این شغل بی اصل گردد[1]"۔

صاحب ریاض حسنی بھی مرزا صاحب کے معاصر و معتقد ہیں، وہ بھی یہی کہتے ہیں کہ

"اکثر اوقات گرامی خود را در تکرار حدیث معروف می دارد..... از آنجا کہ آب و گلش تخمیر یافتۂ سخن است عنان اشہب فکر را در ساحت فصاحت این فن می گرداند[2]"۔

تذکرۂ مسرت افزا بھی مرزا صاحب کی زندگی میں (۱۱۹۳ھ) لکھا گیا اس لیے اس کے مصنف کا بیان بھی اہمیت رکھتا ہے:

"اگر چہ شعر گوئی شعار وی نیست چوں چاشنیٔ محبت چشیدہ است ..... گاہ گاہ از کشش طبع رسا، فی الضمیر را در قالب نظم فارسی و ریختہ ظاہر می کند[3]"۔

قائم چاندپوری نے اسی بات کو زیادہ صفائی سے یا کھل کر کہا ہے:

"در اوائل جوانی ..... بشعر و شاعری مشغول بود، آخر حال خود را از آن اندیشہ باز داشت

[1] میر تقی میر: نکات الشعرا ص ۵، [1] فتح علی گردیزی: تذکرۂ ریختہ گویان ص ۱۳۱، [2] عنایت اللہ فتوت: ریاض حسنی، قلمی (کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد)، [3] ابو الحسن امیر احمد: تذکرۂ مسرت افزا بحوالہ معاصر پٹنہ جلد ۲ حصہ

بر سجادۂ طاعت بفقر و قناعت می گذارد[۱]"

قدرت اللہ شوق کا بھی تقریباً یہی بیان ہے،

"در ابتدای حال عالم شباب التفات بشعر و سخن داشت ۔ ۔ ۔ ۔ از مدتی ترک سخن

گوئی نمودہ سوای شغل فقر و فنا و ارشاد طالبان کاری نداشت[۲]"

مصحفی کے قول سے بھی مندرجہ بالا تذکرہ نگاروں کے بیان کی تائید ہوتی ہے،

در ابتدای شعور عشق در طبیعتش مضمر بود، اکثر شعر عاشقانہ تعبیر کردہ، چنانچہ خود میگوید

مرا چہ جرم کہ بر نالہ ام رموز دانی ۔۔۔ غلط کنند عزیزان بمصرع استاد[۳]"

قائم، شوق اور مصحفی اگرچہ دہلی کے رہنے والے نہیں تھے لیکن مدتوں دہلی میں رہے، اس لیے انھوں نے جو کچھ لکھا ہے یقیناً اس میں حقیقت و صداقت کی جھلک موجود ہوگی،

خود مرزا صاحب نے بھی اپنے فارسی دیوان کے دیباچہ میں (محررہ ۱۱۷۰ھ) لکھا ہے کہ

ہرچہ خارج ازین جمع است طرح دانند مگر از واردات تازہ کہ بسیار کم اتفاق می افتد[۴]"

اسی طرح ایک مکتوب میں لکھتے ہیں کہ

"ذوق سخن از یاد رفتہ بعد عمری غزل تازہ بر زبان رفت[۵]"

اور یہ غزل بھی صرف تین اشعار پر مشتمل ہے،

ان بیانوں اور تحریروں سے ثابت ہوتا ہے کہ زندگی کا آفتاب ڈھل جانے کے بعد[۶] مرزا صاحب کو شعر و شاعری سے بہت کم دلچسپی رہ گئی تھی،

---

[۱] قائم چاندپوری: مخزن نکات ص ۴۳ [۲] قدرت اللہ شوق: تکملۃ الشعراء قلمی (رضا لائبریری، رام پور)

[۳] مصحفی: عقد ثریا ص ۵۵ [۴] مرزا مظہر: دیوان مظہر جان جاناں دیباچہ ص ۲ [۵] کلمات طیبات، مکتوبات مرزا صاحب مکتوب پنجاہ و ہشتم ص ۵۵

[۶] مرزا صاحب نے ایک مکتوب میں لکھا ہے کہ تا امروز کہ یک ہزار و صد و ہشتاد و پنج ہجری است ۔ ۔ ۔ ۔ از سی سال بہ تربیت طالبان خدا مشغول است یعنی تقریباً ۱۱۵۵ھ سے مرزا صاحب ارشاد و ہدایت میں مشغول ہوئے۔ ان کا سال پیدائش ۱۱۱۱ھ یا ۱۱۱۳ھ ہے، اس لحاظ سے ۱۱۵۵ھ میں انکی عمر تقریباً ۴۲، ۴۳ سال تھی،

تلمذ میر غلام علی آزاد بلگرامی سرو آزاد میں میر غلام نبی بلگرامی کے سلسلۂ حالات میں لکھتے ہیں کہ "مرزا جان جاناں مظہر سلمہ اللہ تعالیٰ فن شعر ہندی از غلام نبی اخذ نمودہ[۱]"

تذکرۂ حسینی کے مصنف کا بیان ہے کہ

"از مستفیدان مرزا بیدل است[۲]"

صاحب تذکرۃ الشعراء نے بھی لکھا ہے کہ

"در فارسی استفادہ مرزا بیدل دارد[۳]"

تذکرۃ الشعراء کے بیان کا ماخذ تذکرۂ حسینی ہے کیونکہ یہ تذکرہ ان کے آخذ میں گنا گیا ہے اس لیے ان دونوں بیانات کو ایک ہی سمجھنا چاہیے، لیکن ان بیانات کی تائید کسی معاصر یا بعد کے تذکرہ سے نہیں ہوتی اور اس سلسلہ خود مرزا مظہر کا یہ دعویٰ ہے کہ

بحرف کس نہ نہاد حرف من مظہر چو جبر قلم ۔۔۔ خدا بی واسطہ تعلیم و اصلاح سخن کردہ

تخلص مرزا صاحب کے زمانہ میں ایک صاحب غلام علی نام کے تھے اور مظہر تخلص کرتے تھے، ایک دن انھوں نے مرزا صاحب سے کہا کہ میں تم سے عمر میں بڑا ہوں اور میں نے یہ تخلص پہلے اختیار کیا ہے، پھر تم نے یہ تخلص کیوں رکھا؟ مرزا صاحب نے جواب دیا کہ مجھے یہ تخلص مولوی معنوی نے عنایت کیا ہے، چنانچہ یہ طے پایا کہ مثنوی معنوی سے فال لی جائے، شاہ غلام علی نے فال نکالی تو یہ شعر نکلا:

جان اول مظہر درگاہ شد ۔۔۔ جانِ جان خود مظہر اللہ شد

آخر دونوں صاحبوں نے مظہر تخلص برقرار رکھا،

انداز شعر خوانی مرزا صاحب کے شعر پڑھنے کا انداز بہت دلکش تھا، صاحب سفینۂ ہندی

---

[۱] آزاد بلگرامی: سرو آزاد ص ۳۱۳ و ۳۷۲ [۲] حسین دوست سنبھلی: تذکرۂ حسینی ص ۲۲۷ [۳] مولانا عبد الغنی: تذکرۃ الشعراء ص ۱۲۵ [۴] آزاد بلگرامی: ید بیضا، بھگوان داس ہندی، سفینۂ ہندی (قلمی) (بانکی پور)

کا بیان ہے کہ:

اشعار بطوری می خواند کہ اکثری بذوق شنیدن در خدمتش حاضری می شدند"[1]

فارسی کلام | مرزا مظہرؒ کے فارسی کلام کا کچھ حصہ پہلی بار ۱۱۵۰ھ میں ان کے ایک مرید کی کوشش سے مرتب ہوا تھا، اور اس پر خود مرزا صاحب نے دیباچہ لکھا تھا[2]۔ اس کے بعد ۱۱۷۰ھ میں مرزا صاحب کو اپنے کلام کو از سر نو مکمل طور پر مرتب کرنے کا خیال پیدا ہوا، اس کا سبب خود ان کی زبان سے سنیے:

"ارباب نقل و روایت تصرفہای نمایاں کردہ نسخہ ہای غلط رواج دادند و کور سوادان چنیکہ نداشتند از انصاف پوشیدہ نقصان عائد کشان قائل کردند و بمغز سخن نارسیدہ در پوست این ناتوان افتادند"[3]

اوپر ہم نے بتایا ہے کہ مسند ارشاد و ہدایت پر بیٹھنے کے بعد مرزا صاحب کے وقت کا زیادہ حصہ مریدوں کی ہدایت و تربیت میں صرف ہوتا تھا، اور شعر گوئی کی طرف ان کی توجہ بہت کم ہو گئی تھی، انھوں نے جو کچھ کہا تھا اس کے تحفظ کا بھی کچھ زیادہ خیال نہ تھا، لیکن (۱) چونکہ شاعر کا کلام اس کی اولاد معنوی ہوتی ہے (۲) لوگوں نے ان کے کلام میں تصرف کرکے غلط اشعار کو رواج دیا اور ان پر بلا وجہ تنقیدیں ہونے لگیں (۳) اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ایک مرید نے یا مرزا صاحب کے الفاظ میں "نوجوانی سراپا جانی" نے منتشر اشعار کو مرتب کرنے اور غلط اشعار کی تصحیح کے لیے اصرار کیا، اس لیے مرزا صاحب نے اپنے منتشر کلام کو یکجا کرنے کی طرف توجہ کی، "تلاش و جستجو کے بعد" "از سفینہ ہای بسیار" میں ہزار اشعار جمع ہوئے، ان میں سے مرزا صاحب نے صرف ایک ہزار اشعار کا انتخاب کیا اور باقی کو قلمزد کر دیا، اور دیباچہ

---

[1] بھگوان داس ہندی: سفینۂ ہندی، قلمی نسخہ (بانکی پور) [2] مرزا مظہرؒ: دیوان مظہر جان جاناں دیباچہ ص ۲ [3] ایضاً ص ۲

میں لکھا کہ "ہر چہ خارج ازیں جمع است طرح دانند مگر از واردات تازہ کہ بسیار کم اتفاق می افتد یا از مسودات کہن آنچہ میسر می آید و از نظر می گذرد درج نمودہ می شود مسلم است"[1]۔ ان کا یہ مختصر دیوان "بے ترتیب ردیف و اکثرش غزلہای ناتمام" پر مشتمل ہے۔

مرزا مظہرؒ نے اردو میں بھی اشعار کہے ہیں، اگرچہ یہ اشعار تعداد میں بہت کم ہیں، لیکن معنوی لحاظ سے ان کی بڑی اہمیت ہے، وہ اردو شاعری کے مصلح تھے، اور اس کی تاریخ میں مرزا صاحب کا ممتاز مقام ہے، انھوں نے معیار تغزل کو بلند کیا، انہی کی کوشش سے "ریختہ سی زبان" نے تہذیب و شائستگی پائی، حاتم، سودا، میر، قائم وغیرہ کی کوششیں ان کے بعد شروع ہوئیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ مرزا صاحب اصلاً فارسی کے شاعر تھے، کیفیت سے قطع نظر ان کے اشعار کی تعداد (۲۰ ہزار اشعار) بھی ان کے فارسی گو شاعر ہونے کی دلیل ہے لیکن چونکہ مرزا صاحب کا زمانہ وہ ہے جب فارسی کی طرف سے لوگوں کی توجہ کم ہونے لگی تھی، اردو شاعری بال و پر نکال چکی تھی، اور اردو زبان ہمہ گیر شکل اختیار کر رہی تھی، ان سب سے بڑھ کر یہ کہ خود مرزا صاحب نے اردو غزل کو تغزل کا حقیقی رنگ بخشا اور اس کو ایہام کے خرافات سے پاک کرکے شستہ و مہذب بنایا، اس لیے اردو شاعر کی حیثیت سے انھیں اتنی اہمیت حاصل ہوئی کہ لوگوں کی توجہ ان کے فارسی کلام کی طرف سے ہٹ گئی،

مرزا صاحب کے فارسی کلام کی توصیف ان کے ہمعصروں نے بھی کی ہے، اور بعد کے نقادوں نے بھی، مثلاً میر تقی میر انھیں سلیم و کلیم کا ہمپایہ مانتے ہیں[2]، گردیزی کو ان کے فارسی اشعار میں غایت درجہ لطافت ملتی ہے، میر اشرف علی فغاں اور قدرت اللہ قاسم ادا بندی میں

---

[1] مرزا مظہر: دیوان مظہر جان جاناںؒ، دیباچہ ص ۲ [2] میر تقی میر: نکات الشعرا ص ۵ [3] فتح علی خاں گردیزی: تذکرۂ ریختہ گویان ص ۱۳۱ [4] میر اشرف علی فغاں: تذکرۃ الشعرا قلمی (رضا لائبریری رام پور)

انھیں بے مثل بتاتے ہیں[1]۔ نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ ان کے خیالات میں لطافت پاتے ہیں[2]۔ صاحب مقالات الشعراء کو ان کے یہاں نزاکت معانی اور ادا بندی نظر آتی ہے[3]۔

ہر بڑے شاعر کی طرح مرزا صاحب کو بھی اپنے کلام کی عظمت کا احساس تھا، چنانچہ بعض اشعار میں اس کی طرف اشارہ ملتا ہے۔ مثلاً

تواند نالہ کردن با چنیں خوبی و موزونی   بہ جو مظہر ہر کہ یاد دیوانگیہا میرزا باشد

سر فرو باکس نمی آریم در طرز سخن   خوش ادائیہائی مظہر میرزا را بندہ ایم

حاجتم نیست بتعریف عزیزان مظہر   کہ سخن می کند اظہار سخن دانی من

کنوں ز طبع بلند جو دم یقیں کردید   کہ بر زمین غزل نیز آسمانی ہست

بحرف کس نماند حرف من مظہر چو جبریلم   خدا بی واسطہ تعلیم و اصلاح سخن کردہ

مرزا صاحب صوفی تھے، حسن مطلق کے پرستار تھے، حسن کہیں ہو کسی شکل میں ہو وہ اسکی قدر کرتے تھے، اس میں ان کے مشرب کو بھی دخل ہے، وہ وحدت شہود کے ماننے والے تھے، اس لئے دنیا کی ہر شے میں انھیں حسن مطلق کا پرتو نظر آتا تھا، حسن کی پرستش کی وجہ سے ان کے یہاں جذبۂ فدائیت ہے، ان کے نزدیک عاشقی فن شریف ہے، ان کے جذبات میں خلوص اور الفاظ میں تاثیر ہے، ان کا شیوۂ تسلیم و رضا، محاسن کائنات و حیات کا احساس پیدا کرتا ہے، وہ اپنے اشک خوں آلود کے ہر قطرہ کو گلبرگ سے زیادہ رنگین پاتے ہیں، ان کی آہ درد آلود دنیا کا بہترین نغمہ اور حقیقی عاشقی ہے، وہ اپنے آپ کو خلیل عشق کے لقب سے یاد کرتے ہیں، اس لیے ہر غم ان کا مہمان ہوتا ہے، ان کے یہاں وصل کی تمنا اور ہجر کی بے قراری ضرور ہے لیکن محرومی دیدار سے بے تابی نہیں، تڑپ اور فریاد ہے مگر نالہ و شیون اور صدائے ماتم نہیں، ان کی فغاں فغان خاموش ہے

---

[1] میر شوقی کی خان: تذکرۃ الشعرا قلمی (رضا لائبریری رامپور) قدرت اللہ قاسم، مجموعۂ نغز، ج ۲ ص ۱۹۸ [2] نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ: گلشن بیخار ص ۲۲۲ [3] قیام الدین حیرت اکبرآبادی: مقالات الشعرا قلمی (رضا لائبریری، رام پور)

ہمسایہ کی نیند حرام کر دینے والی نہیں، ان کے یہاں محبوب کا احترام ہے، وہ اس کی بے رخی بیگانگی اور دوسرے آزمائشی طریقوں پر داد و فریاد نہیں کرتے بلکہ خوشی کا اظہار کرتے ہیں، کہ اس سے انھیں اپنی وفا کے ثبوت بہم پہنچانے کا موقع ملتا ہے، محبوب کو اپنے سامنے دیکھکر انکا دست فریاد دست دعا میں تبدیل ہو جاتا ہے، مختصر یہ کہ ان کا کلام کیفیات عشق میں ڈوبا ہوا ہے اور یہی اس کی سب سے نمایاں خصوصیت ہے، اس خصوصیت نے ان کے کلام میں شیرینی و تازگی پیدا کر دی ہے، خود مرزا صاحب کو بھی اس کا احساس تھا، چنانچہ ایک مقطع میں فرماتے ہیں:

حلاوت می چکد از گفتگوی عشق ما مظہر   چو برگ گل زبان را در شکر گیرد بیان ما

یہاں ہم مرزا صاحب کے چند اشعار نقل کرتے ہیں جن میں مختلف کیفیات عشق کی مصوری پائی جاتی ہے:

بنا کردند خوش رسمی بخون و خاک غلطیدن   خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

چہ خوش بردی دل تنگ یار دری واکرد   خدا دراز کند عمر زخم کاری ما

لذت صد زندگی در نیم کشتن می دہد   تیر مژگان بتاں پیکان زہر آلود نیست

غلام عشقم و لطف و کرم بہای منست   کسی کہ بندہ بخواند مرا خدای منست

ہزار عمر فدای دمی کہ من از شوق   بخاک و خوں تپم و گوئی از برای منست

کیست امروز بجز مظہر دیوانۂ ما   آنکہ ہر شب بہ تمنای تو صد بار گریست

زخم دل مظہر مبادا بہ شود ہشیار باش   کیں جراحت یادگار ناوک مژگان دوست

باز شاہد شد ای عاشقی گل بپیرہنی   مظہر ایں چاک گریبان تو بی چیزی نیست

حیف دردی کہ بجو ننگ مداوا بر داشت   بہر جانی نتواں ناز مسیحا بر داشت

خدا از تہمت راحت پرستیہا نگہدارد   خوشا مردی کہ درد بار طبعش را دوا باشد

اگر چہ طاقت یک گردش نگاہم نیست   خدا کند ہمہ نازش بجان من باشد

رحم برحال دلم کردی دمن داغ شدم کایں دلی بود کہ شائستۂ آزار تو بود

آں کشتۂ تیغ حق محبت ادا نکرد کز بہر دست و بازوی قاتل دعا نکرد

دین ما دیدن و ہیہات کہ دیدن مشکل نہ رسیدن بہ بتان کفر و رسیدن مشکل

از برای سجدۂ عشق آستانی یافتم سرزمینی بود منظور آسمانی یافتم

سر آں غرور گردم کہ کند چو لطف بر من سر یا زنی و پرسی کہ بگو چہ حال داری

ان تمام اشعار میں داخلی واردات کی عکاسی پائی جاتی ہے، جو ان کے کلام کی سب سے نمایاں خصوصیت ہے۔ لیکن ان کا کلام خارجی کیفیات کی مصوری سے بھی خالی نہیں، اور ان کے یہاں اس قسم کے اشعار بھی پائے جاتے ہیں:

باشد بوصفِ لعل لبِ دلستانِ ما مانند غنچہ پر ز زبا نہا دہانِ ما

غنچہ ساں مظہر ز خون دل دہن پر می شود یاد می آید چو آں لبہائے عنابی مرا

نثار داد نزاکت ز بسکہ رنگ ترا تن تو ساخت گلابی قبای تنگ ترا

ای سرو باین جامۂ کوتاہ نبازی رعنائی معشوق ز دامان دراز است

کرد رنگین ز خط سبز تو رخسار ترا گلشن تصویر ز مو باغبانی می کند

از رخ پر عرق گریہ بشور آمدہ است آب بر آب چو افتد بفغان می آید

می تواں داد بما خدمت خیاطی خویش کہ ببالای تو عمریست نظر دوختہ ایم

تخئیل کو شاعری میں بڑی اہمیت حاصل ہے، اسلوب بیان اور طرز ادا کے شیدائی بھی اسکی اہمیت سے انکار نہیں کر سکتے، کسی زبان کا شعری سرمایہ محض اسلوب بیان کیوجہ سے زندہ نہیں رہ سکتا تخئیل اور اسلوب بیان دونوں ملکر اسکو دوام بخشتے ہیں، لیکن تخئیل کے پردہ میں خیالات کے طوطا مینا بناکر اڑانے سے شعر کی لطافت ختم ہوجاتی ہے، ہندستان کے فارسی گو شعرا میں مرزا عبدالقادر بیدل عظیم آبادی پیچیدہ تخئیل کے لیے مشہور ہیں، ان کی تخئیل اسقدر

پیچیدہ اور استعارے ایسے دور از کار ہوتے ہیں کہ پڑھنے والا الجھن میں پڑ جاتا ہے، مولانا شبلی شعر العجم میں لکھتے ہیں کہ

فغانی کے سلسلہ میں رفتہ رفتہ خیال بندی مضمون آفرینی، وقت پسندی پیدا ہوئی ..... اور یہی طرز مقبول ہوکر تمام دنیائے شاعری پر چھا گیا اور چونکہ اس طرز کی بے اعتدالی سخت مضر نتائج پیدا کرتی ہے، اس لیے ملک سخن ناصر علی، بیدل وغیرہ کے قبضۂ اقتدار میں آگیا اور اس طرح ایک عظیم الشان سلسلہ کا خاتمہ ہوگیا"[۱]

مرزا مظہرؒ کے عہد میں بیدلؔ کی شاعری کا بڑا چرچا تھا لیکن انھوں نے اپنے حسن مذاق کی وجہ سے اس رنگ کے قبول کرنے سے احتراز کیا، ان کے یہاں نہ پیچ پیچ تخئیل ملے گی اور نہ دور از کار استعارے، اس کے باوجود ان کی شاعری لطافت خیال سے خالی نہیں؛ اسکی مثالیں ملاحظہ ہوں:

قضا از مشہد ما مشت خونی وام می گیرد کہ تا رنگیں کند ہنگامۂ روز قیامت را

بی کسی مشہور کرد آخر بیکتائی مرا داد تشریف خدائی فیض تنہائی مرا

علوِ رتبہ ام در عالم بی رنگی ببیں بنگر کہ دستم را ز عار از پا فتادن ہم نمی گیرد

شب نمود ند بمن نامۂ اعمال مرا صبح دیدم کہ بدستم سر گیسوئی تو بود

داغم ز تنگ فرصتیٔ دل کہ چون سپند عمرش برای نالۂ دیگر وفا نکرد

از آں پیراہن خود چاک می سازم کہ می ترسم گریبانم بمحشر آید و دامان من گیرد

حرفی نساخت نامہ برم از زبان یار شرمش نیامد از دل امیدوار من

مرزا صاحب بادۂ عرفاں سے سرشار تھے، اس لیے صوفیانہ خیالات ان کے کلام میں بہت نمایاں ہیں، اور اس قسم کے اشعار ان کے یہاں اس کثرت سے ہیں جس سے سلوک و تصوف

[۱] مولانا شبلی: شعر العجم ج ۵ ص ۶۷

کے مختلف منازل و مدارج کی پوری تشریح ہو جاتی ہے، اور موضوع کی سنجیدگی اور خشکی کے باوجود اس قسم کے اشعار میں پوری لطافت موجود ہے، مثلاً

مہر و مہ، ارض و سما آئینۂ شکل اند ہمہ — می تواں یافت کہ در پردہ خود آرائی ہست

کثرت ایں نقشہا عین تجلیہای اوست — در دو عالم غیر یک نقاش کس موجود نیست

رستن از قید خودی مظہر بحق پیوستن است — قطرہ بودم بحر یک کشتی شنا گم کردہ است

مظہر طلبی کرا جہاں منزل راحت — بگذر ز تو خود در پس ایں پردہ مقام است

مفت دیدنہا کہ با آئینہ خوش ہنگامہ ایست — یار محو عکس خویش و عکس او حیران اوست

با کمال خود فروشیہا گرفتار خود است — می کند آرایش خویش و تماشا می کند

آہ مظہر! تو کجائی کہ پی جستن تو — مہ جدا، مہر جدا، چرخ جدا می گردد

وسعت مشرب چہ دنیای فراخی بودہ است — چوں فلک در گردش ساغر جہانی یافتم

طرفہ شمعی تو کہ چوں صورت فانوس خیال — متصل گرد تو می گردم و حیران توام

چناں از خویش می رفتم کہ ہرگز بر نمی گشتم — اگر می بود در دستم عنان اختیار من

انسانی زندگی کی ناپائداری اور دنیا کی بے ثباتی سے متعلق بھی مرزا صاحب کے چند اشعار سنتے چلئے، دنیا کی بے ثباتی اور انسانی حیات کی ناپائداری بڑا فرسودہ و پامال مضمون ہے ہزاروں اشعار اس موضوع پر فارسی شاعری میں ملیں گے، لیکن یہ ایک ایسا موضوع ہے جس پر طبع آزمائی کرنے سے کوئی شاعر اور خصوصاً صوفی شاعر بچ نہیں سکتا، مرزا صاحب کے ان اشعار میں ندرتِ بیان نے تازگی اور اشارہ و کنایہ نے تاثیر پیدا کر دی ہے،

مبادا البلبل دیگر پس از من آشیاں بندد — تواں آویخت بر شاخ بلندی استخوانم را

عمرہا شد خوش بکنج نیستی آسودہ است — مرزا مظہر حریف بزم ہست و بود نیست

یارب چہ فتاد بلبلاں را — در باغ نشان آشیاں نیست

عمر ما در عین ہشیاری بغفلت رفت حیف — آنچہ بیداری گماں کردیم خوابی بودہ است

مظہر خوش گوئی ما ز آغاز و انجامش مپرس — گشت از خواب عدم بیدار و باز افسانہ شد

بکنج باغ ز بیداد ظالمانی چند — فتادہ اند پری چند و آشیانی چند

بلبل کجا رود، چہ کند کاندریں چمن — بشگفت غنچہ ای کہ بگلچیں خبر نشد

مرزا صاحب کے کلام میں گو بڑی متانت و سنجیدگی ہے، لیکن ان کی متانت بوجھل نہیں بلکہ لطیف و جمیل ہے، مرزا صاحب کی زندگی میں بھی متانت کے ساتھ لطافت تھی، ان کے یہاں تقدس تھا، تقشف نہیں تھا، زہد تھا، خشکی نہیں تھی، اسی لیے ان کے کلام میں نغمہ و سرود اور جوش و سرمستی کی لہریں بھی پائی جاتی ہیں، ان کے اس رنگ کے اشعار حافظ کے رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں، وہی رندی و سرمستی کا عالم ہے، جس کے لیے حافظ کا کلام ممتاز ہے، وہی سبزہ و بہار سے لطف اٹھانے کی کیفیت ہے، جس کی بہار حافظ کے کلام میں نظر آتی ہے، یوں تو مرزا صاحب کے سارے کلام میں "خمارِ چشم ساقی" کا اثر پایا جاتا ہے، لیکن اس رنگ کے اشعار میں یہ اثر شدید ہو جاتا ہے، مثلاً یہ اشعار

ساقی بدہ آں می کہ ز مستی نشناسم — پیمانہ کدام و لبِ جاناں کدام است

جوش زد مستی ز چشم دلبراں میخانہ شد — مشت خاک می پرستاں ہر چہ خ زد پیمانہ شد

نگاہِ مستِ تو آنرا کہ مستفید کند — ہزار پیر خرابات را مرید کند

شور یاراں بر نمی تابد سر مخمور من — پنبہ بردار از سر مینا و در گوشم گذار

بی حمایت نبود میکشئی ما زاہد — سایۂ دست خدا ابر بود بر سر ما

دشت را با و بہاری ز رشک صد میخانہ ساخت است — ہر طرف رعنا غزالی مست خواب افتادہ است

مہتاب و شراب و انتظارت
این روز قیامت است شب نیست

سرمست گردم چو نرگس در خیال چشم مخمورت
بجای اشک ہر مژگان من ساغر بروں آوردہ است

ز یک سو بوی گل و ز یک طرف پیغام یار آمد
من آں دیوانہ ام کز ہر دو سوی من بہار آمد

نو بہار آمد مرا زنجیر در گلشن کنید
دوستاں امسال تدبیرم بطور من کنید

گو ان اشعار میں ابر و باد، سبزہ و باراں اور خمار چشم ساقی کے اثر سے جوش و مستی پیدا ہوئی ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ مرزا صاحب کے کلام کی خصوصیت ان کا جوش بیان بھی ہے، ان کے کلام کی بنیاد وارداتِ قلبی، کیفیاتِ عشق اور سوز و گداز پر ہے، لیکن وہ فطرۃً زندہ دل اور شگفتہ مزاج تھے، اس لیے ان کی کیفیاتِ عشق میں نوحۂ غم کا جوش انبساط ہے، وہ درد و الم کو مقصود عاشقی سمجھتے ہیں، اس لیے صدائے ماتم برپا نہیں کرتے، بلکہ اپنے دل کو شائستۂ آزار سمجھ کر خوشی محسوس کرتے ہیں، اس لیے جذبۂ بے اختیار شوق کا اظہار بڑے جوش و مسرت کے ساتھ کرتے ہیں، جوش بیان کے لیے کسی خاص موضوع کی قید نہیں، ہر قسم کے خیالات جوش کے ساتھ ظاہر کیے جاسکتے ہیں، لیکن مرزا صاحب کے کلام کی بنیاد کیفیات عشق پر ہے، اس لیے یہاں ہم مثالاً صرف ایسے ہی اشعار نقل کرتے ہیں جن میں واردات حسن و عشق کا بیان پایا جاتا ہے۔

ز عشق او بداغی کی تسلی می شوم مظہر
کہ غرق سوختن چوں شعلہ می خواہم سراپا را

ہزار عمر فدای دمی کہ من از شوق
بخاک و خوں طپم و گوئی از برای منست

در چشم من کہ بی تو دلم را قرار نیست
آتش بلند گشتہ ز گلشن بہار نیست

حسن ادب نگر کہ بعشقت بریختم
اشکی کہ رشک صد گہر آبدار نیست

ہیچ گلبرگ برنگ اشک خوں آلود نیست
ہیچ آہنگی بذوق آہ درد آلود نیست

سیل خوں از سینۂ گرمم رواں کردست عشق
نازم اعجازش کہ طوفاں از تنور آوردہ است

شام من پروردہ در آغوش صبح فتنہ زا
روز محشر قرۃ العین شب تار منست

ز صد جا چاک سازد جامہ را انداز حسن او
چو آں صہبا کہ پرزور در مینا نمی گنجد

دماغ عشق نازک تر ز حسن است
ترا رنگ و مرا بو آفریدند

از برای سجدۂ عشق آستانی یافتم
سر زمینی بود منظور آسمانی یافتم

گریستن نیز طرز عرض احوالست می گریم
فغاں ہم طوری از اطوار گفتار منست می نالم

حسن کلام کا ایک بڑا معیار اس کی تاثیر ہے، جس کے لیے سوز و گداز ضروری ہے، مرزا مظہرؒ شگفتہ مزاجی کے ساتھ پہلو میں دل گداختہ رکھتے تھے، اس لیے ان کے اشعار سوز و گداز سے خالی نہیں ہیں، لیکن ان کے سوز میں مرثیہ خوانی نہیں، سوز و گداز اور آہ و بکا دو مختلف چیزیں ہیں، عاشق کی فغاں عام آدمی کی صدائے ماتم سے مختلف ہوتی ہے، سوز و گداز حقیقت دل کی لطیف دردمندانہ کیفیت کے اظہار کو کہتے ہیں، مرزا صاحب کا دل کیفیات عشق سے لبریز تھا، اس لیے ان کے اشعار میں حسن کی تمکنت اور محبت کی رنگینی کے ساتھ ساتھ عشق کی تڑپ بھی پائی جاتی ہے، چند اشعار ملاحظہ ہوں،

نہ پا گل واشدم گاہی نہ گرد شمع گردیدم
چہ واقع شد کہ آزردی چو من آزردہ جانی را

آں بلبلم کہ چوں بچمن فصل گل رسد
ریزد چو برگہای خزاں بال و پر مرا

چشم من بسکہ ز محرومی دیدار گریست
گریہ از رحم بریں دیدۂ خونبار گریست

جامی رحمت ای ہجوم آہ و ای سیلاب اشک
یادگار از من ہمیں مشت غباری ماندہ است

شد پریشاں مجمع احباب و مدتہا گذشت
ظاہرا ہاں فرقۂ مظہر نام یاری ماندہ است

بی کسی را چہ بمعراج رسانندی مظہر
جز غم یار کسی مونس و غمخوار تو نیست

منم آں بلبل بی بال و پر کز نا امید یہا
ندارم خوش کہ از گل پرسم و حرفِ از چمن گویم

شاعری کی ایک اہم صنعت تمثیلی بھی ہے، اس صنعت نے حقیقۃً صنف کا درجہ حاصل کر لیا ہے، تمثیلی شاعری کی تعریف یہ ہے کہ شاعر ایک دعویٰ کرتا ہے اور پھر اس دعوے کی دلیل پیش کرتا ہے، لیکن یہ ضروری نہیں کہ یہ دلیل منطقی یا عقلی حیثیت سے بھی صحیح ہو، قدیم فارسی شاعری میں بھی اس کے نمونے ملتے ہیں، لیکن اس رنگ شاعری کے گل سرسبد صائب ہیں، صائب سے متاثر ہو کر ہندوستانی شعراء میں غنی کاشمیری، ناصر علی سرہندی وغیرہ نے تمثیلی رنگ کے اشعار بہت کہے ہیں، مرزا صاحب نے جب ہوش کی آنکھیں کھولیں تو ان شعرا کا کلام زبانوں پر تھا، مگر انھوں نے یہ رنگ اختیار نہیں کیا، کیونکہ یہ رنگ ان کی طبیعت سے مناسبت نہیں رکھتا تھا، پھر بھی اس رنگ کے چند اشعار ان کے یہاں پائے جاتے ہیں اور توجہ سے پڑھنے کے لائق ہیں، مگر ان کی تمثیلیں بھی دور از کار نہیں اور نہ شعریت سے خالی ہیں۔

عیب بینان واقف از نقصان خویشم کردہ اند
ہمچو عینک ساخت چشم دیگراں بینا مرا

ارباب صفا دست ز دشمن نشناسند
بر روی بد و نیک در آئینہ باز است

درویش را ز نعمت دنیا نصیب نیست
ہرگز شکر بکام نی بوریا نشد

بی طلب چیزیکہ می باید بہر کس می دہند
از عدم نرگس عصا با چشم کور آوردہ است

سینہ ام کسب صفا از خاکساری می کند
از غبار آئینہ مشق بی غباری می کند

بر اہل استقامت فیض نازل می شود مظہر
نمی دانی تجلی گرد کوہ طور می گردد

تمثیلی اشعار سے عموماً اخلاقی تعلیم و تلقین کا کام لیا گیا ہے، اس لیے مرزا صاحب کے ان اشعار میں بھی اخلاقی تلقین ہے، لیکن فارسی میں اس رنگ کے عشقیہ اشعار کی بھی کمی نہیں، مرزا صاحب کے یہاں بھی تمثیلی رنگ کے عشقیہ اشعار پائے جاتے ہیں، مثلاً

دلبراں ہم نالہ دارند اما نازک است
بانگ گل این نکتہ می گوید بسر گوشی مرا

عشق را گر رخصت شوخی نمی بودی ز حسن
دست کے کردے زلیخا سوی پیراہن دراز

کارگاہ حسن را از فیض مژگانم صفاست
خانۂ تصویر را جز مو قلم جاروب نیست

دلم بروی تو این دیدۂ پر آب گذاشت
کہ رخت تر شدہ را پایہ آفتاب گذاشت

دشمن دوست شدن لازم حسن افتادہ است
شمع خواہد کہ ز پروانہ پری نگذارد

مرزا صاحب کی شاعری اگرچہ عشقیہ ہے، لیکن ان کے یہاں اخلاقی اور حکیمانہ اشعار بھی ملتے ہیں، ان کی زندگی کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ ان میں استغنا و بے نیازی بہت تھی، چنانچہ ان کے ان اشعار میں بھی اسی فلسفۂ اخلاق کی تلقین پائی جاتی ہے،

زندگی بے منت ار آید میسر باک نیست
ہمتش نازم کہ ممنون مسیحا می شود

ز شرم آنکہ پیش تشنہ کامان تر شود
بلب جانش گر آید نام جام جم نمی گیرد

اگر مظہر بایں ہمت ز خضر آب بقا خواہد
ز ننگ از زندگانی آدم مردن خجل باشد

انفعال جرم بہتر از غرور طاعت است
مظہر ای دور از حقیقت بر نماز خود مناز

شدم عزیز چمن مظہر از سبکروحی
چو بوی گل دل ہر غنچہ آشیان منست

ما والی قلم رو سیر و سیاحتیم
ہر نقش پای خویش بود پای تخت ما

یہ اشعار عالی حوصلگی اور بلند ہمتی کے اعلیٰ و شریفانہ جذبات کے حامل ہونے کے ساتھ شعریت سے بھی خالی نہیں، ان میں پند و موعظت کے ساتھ تغزل کی پوری روح موجود ہے،

امام ابن ماجہ اور ان کی سنن

از مولوی ضیاء الدین صاحب اصلاحی رفیق دار المصنفین

علمائے اسلام نے حدیث کی جن کتابوں کو صحاح میں شامل کیا ہے ان میں سنن ابن ماجہ بھی ہے، جو مختلف حیثیتوں سے حدیث کی نہایت مشہور اور مقبول کتاب ہے اور اردو میں اسکے متعلق کوئی معلومات نہیں ہیں، اس لیے ابن ماجہ کے جو حالات تلاش و تفحص سے معلوم ہو سکے ہیں انھیں پیش کیا جاتا ہے، اور آخر میں سنن کی بعض خصوصیات کا بھی ذکر کیا جائے گا،

نام و نسب ابن ماجہ کا نام محمد اور کنیت ابو عبد اللہ تھی، باپ کا نام یزید اور دادا کا عبد اللہ تھا، ابن ماجہ کے نام سے شہرت کی وجہ یہ ہے کہ ماجہ آپ کے باپ کا لقب تھا بعض اہل سیر و تذکرہ کے نزدیک ماجہ آپ کی ماں کا نام تھا، صاحب الحطہ نے اسی کو ترجیح دی ہے، کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ دادا کا لقب تھا بعض کی رائے یہ بھی ہے کہ آپ کے والد ماجد کا اصلی نام ماجہ تھا[1]، ان سب میں لقب کی روایت زیادہ مناسب معلوم ہوتی ہے[1]،

علامہ ابن کثیر فرماتے ہیں:

ویعرف یزید بماجة[2] — یزید ماجہ کے لقب سے مشہور تھے،

پیدائش اور وطن ایک زمانہ میں قزوین، عراق عجم (ایران) کا مشہور اور مردم خیز شہر رہ چکا ہے

[1] تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۵۳۲ بحوالہ تاریخ الرافعی والحطہ فی ذکر الصحاح الستہ ص ۱۲۸ بحوالہ تہذیب الاسماء وانجاح الحاجۃ [2] تاریخ ابن کثیر ج ۱۱ ص ۵۲

یہاں بڑے بڑے علماء، نامور فضلا، اور اکابر محدثین پیدا ہوئے، علامہ ابن خلکان فرماتے ہیں:

وھی من اشھر مدان عراق العجم خرج منھا جماعة من العلماء[1] — یہ عراق عجم کا مشہور شہر ہے، جس کی خاک سے متعدد علماء پیدا ہوئے۔

یاقوت حموی کا بیان ہے:

وینسب الی قزوین خلق لا یحصون[2] — قزوین کی طرف بیشمار لوگ منسوب ہیں

اسی مردم خیز شہر کو علامہ ابن ماجہ کے مولد و منشا ہونے کا شرف حاصل ہے، وہ یہاں ۲۰۹ھ میں پیدا ہوئے تھے[3]،

طلب علم کے لیے سفر و سیاحت امام ابن ماجہ قدرت کی طرف سے طلب علم کا غیر معمولی شوق و ذوق لیکر پیدا ہوئے تھے، چنانچہ انھوں نے دستور زمانہ کے مطابق حصول علم کے لیے دور دراز مقامات کا سفر کیا اور اس کی جستجو میں کوئی دقیقہ باقی نہیں چھوڑا، جہاں بھی علم کا سرچشمہ نظر آیا اس سے سیراب ہوئے، چنانچہ خراسان، عراق، مصر، شام، بصرہ، کوفہ، مکہ اور ری وغیرہ کے نامور محدثین اور ارباب کمال سے کسب فیض کیا[4]۔

اساتذہ اور شیوخ ان کے اساتذہ کی تعداد بے شمار ہے، ان میں سے چند مشہور اساتذہ کے نام اور مختصر حالات تحریر کیے جاتے ہیں،

محمد بن عبد اللہ بن نمیر ان کا نام محمد کنیت ابو عبد الرحمن، باپ کا نام عبد اللہ اور دادا کا نمیر تھا، وطن کوفہ تھا، سفیان بن عیینہ، مروان بن معاویہ، اسماعیل بن علیہ، حفص بن غیاث، حمید بن

[1] تاریخ ابن خلکان ج ۲ ص ۲۸۴ [2] معجم البلدان ج ۷ ص ۸۲ [3] تاریخ ابن خلکان ج ۲ ص ۲۸۴ و شذرات الذہب ج ۲ ص ۱۶۴ و بستان المحدثین ص ۱۱۲ [4] تاریخ ابن خلکان ج ۲ ص ۲۸۴ و تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۱۰ و تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۵۳۱ و شذرات الذہب ج ۲ ص ۱۶۴ و معجم البلدان ج ۷ و بستان المحدثین ص ۱۱۲

عبدالرحمٰن اور وکیع بن الجراح وغیرہ سے شرف تلمذ حاصل ہے، اور اصحاب صحاح میں ان سے امام بخاری، مسلم، ابوداؤد اور ابن ماجہ نے براہ راست اور امام ترمذی اور نسائی نے امام بخاری کے واسطہ سے روایت کی ہے، اس زمانہ کے تمام اکابر محدثین نے ان کی توثیق کی ہے، ابواسمٰعیل ترمذی کا بیان ہے کہ امام احمد ان کا بڑا احترام کرتے تھے اور "ای فتی" (کیا خوب نوجوان) اور "درۃ العراق" (عراق کا گوہر) کہا کرتے تھے، ابن جنید کہتے ہیں کہ کوفہ میں ابن نمیر جیسا کوئی نہ تھا، ابن سنان کا بیان ہے کہ نوجوانان کوفہ میں ان سے بہتر میں نے کسی کو نہ پایا، ابن عدی فرماتے ہیں کہ میں نے حسن بن سفیان کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ ابن نمیر عراق کی مشک اور یہاں کے افاضل اشخاص میں تھے، وہ اپنے زمانہ کے مشہور محدث اور فن حدیث میں مہارت کی وجہ سے "الحافظ" کے ممتاز لقب سے یاد کیے جاتے تھے شکل و صورت کے لحاظ سے بھی بڑے وجیہہ و شکیل واقع ہوئے تھے، علم و فضل، فہم و ذکا، زہد و اتقا اور فقر و درویشی کے جامع تھے، ابن حبان کے بیان کے مطابق ۱۱ شعبان ۲۳۴ھ میں وفات پائی۔[1]

جبارۃ بن مغلس ان کی کنیت ابو محمد اور کوفہ میں پیدا ہوئے تھے، اکابر محدثین سے روایت کی ہے، اور ابن ماجہ اور بعض دوسرے ائمۂ حدیث نے ان سے روایات بیان کی ہیں، اگرچہ بعض محدثین نے تضعیف اور بعض نے ان کے معمولی سہو و غفلت کا تذکرہ کیا ہے، لیکن ابن نمیر وغیرہ جیسے بلندپایہ محدثین نے توثیق کی ہے، وہ اپنے غیر معمولی علم و کمال کے باعث اس زمانہ کے اکابر لوگوں میں شمار ہوتے تھے، ۲۴۱ھ میں ان کی وفات ہوئی۔[2]

ابراہیم بن منذر نام ابراہیم، کنیت ابو اسحٰق اور مدینہ منورہ وطن تھا، سلسلۂ نسب یوں ہے:- ابراہیم بن منذر بن عبداللہ بن منذر بن مغیرہ بن عبداللہ بن خالد بن حزام بن خویلد بن اسد الاسدی الحزامی،

[1] تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۲۸۲ و ۲۸۳ [2] ایضاً ج ۲ ص ۵۷ و ۵۸

ابن عیینہ، ولید بن مسلم، ابن وہب اور امام دارالہجرت وغیرہ سے شرف تلمذ حاصل ہے، امام بخاری، ابن ماجہ، دارمی اور ابوزرعہ وغیرہ نے براہ راست اور امام ترمذی و نسائی نے بالواسطہ روایت کی ہے،

ابراہیم بن منذر کے حفظ و ضبط کی توثیق یحییٰ بن معین، امام دارقطنی، ابن حبان اور ابن وضاح جیسے اکابر محدثین اور اہل فضل و کمال نے کی ہے، ان کے فضل و کمال کی نسبت صرف اتنا عرض کر دینا کافی ہوگا کہ مدینہ میں پیدا ہوئے تھے، اور امام دارالہجرت (مالکؒ) سے شرف تلمذ حاصل تھا، ان کا انتقال ۲۳۶ھ میں ہوا۔[1]

عبداللہ ابن معاویہ عبداللہ نام، کنیت ابو جعفر اور بصرہ میں پیدا ہوئے، سلسلۂ نسب یوں ہے: عبداللہ بن معاویہ بن موسیٰ بن ابی غلیظ بن نشیط بن مسعود بن امیہ بن خلف جمحی، انھوں نے اکابر محدثین سے کسب فیض کیا، اور جملہ محدثین مثلاً امام بخاری، امام ترمذی اور ابن ماجہ وغیرہ نے ان سے روایتیں بیان کی ہیں، ابن حبان، امام ترمذی، عباس عنبری اور مسلم بن قاسم وغیرہ نے ان کی توثیق اور صلاح و تقویٰ کی شہادت دی ہے، اپنے وطن بصرہ میں ۲۴۳ھ میں انکا انتقال ہوا۔[2]

محمد بن رمح محمد نام، کنیت ابو عبداللہ اور الحافظ کے لقب سے مشہور تھے، سلسلۂ نسب اس طرح ہے: محمد بن رمح بن مہاجر بن محرر بن سالم تجیبی،

امام مالک سے حکایت اور مسلم بن علی، ابن لہیعہ اور امام لیث جیسے اکابر محدثین سے روایتیں بیان کرنے کا فخر حاصل ہے، اور امام مسلم، ابن ماجہ اور بعض دوسرے جلیل القدر محدثین کو ان سے نسبت تلمذ کا شرف حاصل ہے، مشہور محدثین اور ائمۂ فن مثلاً ابوداؤد، ابن جنید، امام نسائی، ابن یونس اور ابن حبان وغیرہ نے ان کی توثیق کی ہے، ابن حبان کے بیان کے مطابق ۲۴۳ھ

[1] تہذیب التہذیب ج اول ص ۱۶۶ و ۱۶۷ [2] ایضاً ج ۶ ص ۳۹

میں وفات ہوئی لیکن امام بخاری اور ابن قدیہ نے لکھا ہے کہ شوال ۲۴۲ھ میں وفات پائی، [1]
ابن کثیر [2] اور ابن عماد [3] نے بھی اسی کو ترجیح دی ہے،

ابوبکر بن ابی شیبہ | عبداللہ نام، کنیت ابوبکر، لقب الحافظ اور کوفہ کے باشندہ تھے، ان کا سلسلۂ نسب یہ ہے: عبداللہ بن محمد بن ابی شیبہ ابراہیم بن عثمان عبسی،

ابن ابی شیبہ نے ابو الاحوص، ابن مبارک، ابن عیاش، وکیع، ابن علیہ اور سفیان ابن عیینہ وغیرہ اکابر محدثین سے روایت بیان کی ہے، اور ان سے امام بخاری، امام مسلم، ابوداؤد، ابن ماجہ نے براہ راست اور امام نسائی نے بالواسطہ روایت کی ہے، اور امام ابن ماجہ کا ان سے استفادہ دوسروں کی بنسبت بہت زیادہ ہے، حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب فرماتے ہیں:

"از ابوبکر بن ابی شیبہ بیشتر استفادہ کردہ" [4]

تمام اکابر محدثین نے بیک زبان ہو کر ان کی توثیق کی ہے، اور (احفظ زمانہ) یعنی اپنے زمانہ میں حدیث کے سب سے بڑے حافظ کا ممتاز لقب دیا ہے، وہ اس دور کے بڑے نامور محدث تھے، یحییٰ بن معین، احمد بن حنبل، اور علی بن مدینی جیسے ممتاز محدثین کے ہم پایہ اور ہم مرتبہ تھے، علامہ ابن کثیر فرماتے ہیں:

ابوبکر بن ابی شیبۃ احد الاعلام [5]	ابوبکر بن ابی شیبہ ایک نامور اور جلیل القدر
وائمۃ الاسلام وصاحب المصنف	امام تھے، اور انکی تصنیف مصنف ابن
الذی لم یصنف مثله قط لا	ابی شیبہ جیسی کوئی تصنیف نہ تو ان کے پہلے
قبله ولا بعده [6]	اور نہ ان کے بعد ہی لکھی گئی،

ان کی وفات ۸۰ سال سے زائد عمر میں محرم ۲۳۵ھ میں ہوئی، [7]

---

[1] تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۱۴۴ و ۱۴۵ [2] البدایہ والنہایہ ج ۱۰ ص ۳۴۴ [3] شذرات الذہب ج ۲ ص ۱۰۱ [4] بستان المحدثین ص ۱۱۲ [5] البدایہ والنہایہ ج ۱۰ ص ۳۱۵ [6] تہذیب التہذیب ج ۶ ص ۲ تا ۴

داؤد بن رشید | داؤد نام، کنیت ابو الفضل اور باپ کا نام رشید تھا،

ان کے اساتذہ میں ہشیم، ولید بن مسلم، عمر بن سلیمان اور ابن علیہ وغیرہ اکابر محدثین شامل ہیں، اور امام ابن ماجہ اور دوسرے طالبان حدیث نے ان سے کسب فیض کیا،

امام مسلم، ابوداؤد، ابن ماجہ، امام دارقطنی اور یحییٰ بن معین جیسے اصحاب علم وفن نے انکے ضبط وثقاہت کی شہادت دی ہے۔ اور ابن حبان نے بھی ثقات میں شمار کیا ہے، بمقام بغداد شعبان ۲۳۹ھ میں وفات پائی، [1]

ہشام بن عمار | ہشام نام، کنیت ابو الولید اور وطن دمشق تھا، ان کا سلسلۂ نسب اس طرح ہے ہشام بن عمار بن نصر بن میسرہ بن ابان،

ان کے اساتذہ میں سفیان بن عیینہ، مالک بن انس، ولید بن مسلم، عبدالرحمن بن زید اور واثلہ وغیرہ اکابر محدثین، اور یحییٰ بن معین، امام بخاری، ابوداؤد، ابن ماجہ، امام ترمذی اور امام نسائی جیسے ائمۂ فن ان کے حلقۂ فیض میں داخل تھے، اور عام طور سے محدثین اور اصحاب فن نے ان کے ضبط وثقاہت کی شہادت دی ہے، وہ اپنے زمانہ کے مشہور محدثین، ممتاز فقہا اور جلیل القدر اہل علم میں شمار ہوتے تھے، تجوید اور خطابت میں بڑا کمال حاصل تھا، اسی لیے دمشق کی جامع مسجد میں قاری اور خطیب مقرر کیے گئے تھے،

ان کے سنہ وفات میں اصحاب سیر وتذکرہ کا اختلاف ہے، اکثر کے نزدیک ۲۴۵ھ اور بعض کے یہاں ۲۴۴ھ اور کچھ لوگوں کے نزدیک ۲۴۶ھ ہے، [2]

یہ امام ابن ماجہ کے سلسلہ کے چند مشہور اساتذہ کا مختصر تذکرہ تھا جن کے ضبط وحفظ کی عام طور سے اکابر محدثین نے شہادت دی ہے،

---

[1] تہذیب التہذیب ج ۳ ص ۱۸۴ [2] ایضاً ج ۱۱ ص ۵۲ تا ۵۴

تلامذہ امام ابن ماجہ ایک جلیل القدر محدث اور بلند پایہ عالم تھے، انھیں فن حدیث اور اس کے تمام متعلقات میں پورا عبور حاصل تھا، اس لیے ان کے دامنِ فیض وکمال سے بڑے بڑے لوگ فیضیاب ہوئے، اور طالبان حدیث اور علم نبوی کے شائق ان کی خدمت میں آکر اپنی تشنگی بجھاتے تھے، علامہ ذہبی اور حافظ ابن حجر وغیرہ نے تلامذہ کی ایک طویل فہرست دی ہے، یہاں صرف ان کے ناموں کے ذکر پر اکتفا کیا جاتا ہے،

علی بن سعید بن عبداللہ الغدانی، ابراہیم بن دینار جرشی، جعفر بن ادریس، احمد بن ابراہیم قزوینی، ابوالطیب احمد بن روح مشعرانی، اسحاق بن محمد قزوینی، حسین بن علی بن برانیاد، سلیمان بن یزید قزوینی، محمد بن عیسیٰ صفار، ابوالحسن علی بن ابراہیم، ابو عمر احمد بن محمد بن حکیم مدنی، سعدون اور ابراہیم بن دینار وغیرہ،

حافظ ابن حجر رافعی کا قول نقل فرماتے ہیں:

والمشهورون براوية السنن ابوالحسن بن القطان وسليمان بن يزيد وابو جعفر محمد بن عيسى وابوبكر حامد الابهرى[1]

سنن کی روایت کرنے والوں میں ابوالحسن بن قطان، سلیمان بن یزید، ابوجعفر محمد بن عیسیٰ اور ابوبکر حامد ابہری بہت زیادہ مشہور ہیں،

حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب تحریر فرماتے ہیں،

"ابوالحسن قطان کہ صاحب روایت سنن اوست از جملہ شاگردان رشید اوست"[2]

ابن ماجہ کی توثیق امام ابن ماجہ کی عظمت وجلالت اور ضبط وثقاہت کے لیے یہ کافی ہے کہ امت نے سنن ابن ماجہ کو بھی صحاح میں شامل کیا ہے، اگرچہ بعض محدثین نے اس سلسلہ میں اختلاف

[1] تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۵۳۲ بحوالہ تاریخ قزوین [2] بستان المحدثین ص ۱۱۲

اور تردد کا بھی اظہار کیا ہے، مگر ان کا یہ تردد صحیح نہیں، آیندہ اس پر تفصیل سے بحث کی جائے گی، یہاں ان کے ضبط وثقاہت کے متعلق علماء ومحدثین اور ائمۂ فن کے اقوال نقل کیے جاتے ہیں،

حافظ ابویعلی خلیلی فرماتے ہیں:

ثقة كبير متفق عليه محتج به وله معرفة بالحديث وحفظ وله مصنفات في السنن والتفسير والتاريخ قال وكان عارفا بهذا الشان[1]

وہ ایک معتبر، بلند پایہ اور لائق حجت واستناد شخص تھے، جن کی عظمت وثقاہت پر اتفاق ہے، انھیں حدیث سے پوری واقفیت تھی، اور وہ اس کے حافظ تھے، سنن، تفسیر اور تاریخ میں انکی کتابیں ہیں اور وہ ان تمام فنون کے بڑے واقف کار اور ماہر تھے،

علامہ ابن خلکان لکھتے ہیں،

كان اماما في الحديث عارفا بعلومه وجميع ما يتعلق به[2]

وہ فن حدیث میں امامت کا درجہ اور اسکے تمام شعبوں اور متعلقات پر بڑی وسیع اور گہری نظر رکھتے تھے،

علامہ ابن اثیر فرماتے ہیں

وله ايضا كتاب السنن وكان عاقلا اماما عالما[3]

وہ صاحب سنن، ذی فہم، صاحب علم اور امام المحدثین تھے،

علامہ ابن جوزی کا بیان ہے

وصنف السنن والتاريخ والتفسير

سنن، تاریخ اور تفسیر کی کتابیں تصنیف کیں

[1] تہذیب جلد ۹ ص ۵۳۱ [2] تاریخ ابن خلکان ج ۲ ص ۲۸۴ [3] کامل ابن اثیر ج ۷ ص ۲۹۸ مطبوعہ لیڈن

وکان عارفا بھذا الشان[۱] اور ان تمام علوم پر پوری نظر رکھتے تھے،

ابو الفداء کا بیان ہے:

مصنف کتاب السنن وکان اماما فی الحدیث عارفا بعلومه وجمیع ما یتعلق به[۲]	سنن کے مصنف اور امام المحدثین تھے حدیث اور اس کے متعلقات میں بڑی مہارت رکھتے تھے،

ابن ناصر الدین فرماتے ہیں:

احد الائمة الاعلام وصاحب السنن احد کتب الاسلام حافظ ثقة کبیر[۳]	مشہور علماء اسلام میں علامہ ابن ماجہ بھی ایک ہیں جو صاحب سنن ہیں اور یہ سنن اسلام کی عظیم ترین کتابوں میں سے ایک ہے، امام ابن ماجہ حافظ الحدیث، معتبر اور بلند پایہ شخص تھے،

ان بیانات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ابن ماجہ اپنے علمی تبحر، فن حدیث میں مہارت اور ضبط و ثقاہت کے لحاظ سے اکابر علماء اسلام اور مشہور ائمۂ حدیث میں شمار کیے جاتے ہیں، اس کی مزید تفصیل آیندہ اوراق میں ملے گی،

امام ابن ماجہ کا امتیاز امام ابن ماجہ اس دور میں پیدا ہوئے جو مسلمانوں کے علمی عروج و کمال کا دور سمجھا جاتا ہے، اس زمانہ میں فن حدیث کا بڑا چرچا اور فروغ تھا، اور اس دور سے زیادہ مجموعی طور پر اس کی خدمت و اشاعت کبھی نہ ہو سکی، نامور محدثین اور تاریخ اسلام کے اساطین سے یہ زمانہ سب سے زیادہ معمور نظر آتا ہے، امام ابن ماجہ اسی علمی عروج و کمال کے زمانے میں پیدا ہوئے تھے، اس لیے قدرتی طور پر انھوں نے فن حدیث میں خاص امتیاز حاصل کیا، اور آپ کا شمار اس زمانہ

[۱] المنتظم فی تاریخ الملوک والامم ج ۵ ص ۹۰ [۲] تاریخ ابو الفداء ج ۲ ص ۵۴

کے اکابر محدثین میں ہوتا ہے، اور آپ کی تالیف سنن اس پر شاہد ہے، ابن ماجہ کا علم محض حدیث ہی تک محدود نہیں تھا، فقہ، اصول فقہ، تفسیر اور تاریخ وغیرہ میں بھی انھیں کامل دستگاہ حاصل تھی، وله مصنفات فی السنن والتفسیر والتاریخ وکان عارفا بھذا الشان.

لیکن سب سے زیادہ امتیاز اور کمال فن حدیث میں حاصل تھا، اس لیے اس نسبت سے وہ مشہور ہوئے، علامہ ابن کثیر فرماتے ہیں:

صاحب کتاب السنن المشھورة وھی دالة علی عمله وعلمه وتبحره واطلاعه واتباعه للسنة فی الاصول والفروع[۱]	وہ مشہور کتاب سنن کے مالک ہیں جو ان کے پختہ عمل، وسیع علم و نظر اور اصول و فروع میں اتباع سنت پر شاہد ہے،

علمی زندگی ابن ماجہ علم و فضل کے ساتھ عمل و اخلاص کے پیکر اور تدین و تقوی اور زہد و صلاح کا کامل نمونہ تھے، اور خدا کے خوف و خشیت سے ان کا دل معمور رہتا تھا، شریعت کے احکام و آداب کی شدت سے پابندی کرتے تھے، اور اصول و فروع، جزئیات و کلیات سب میں اتباع سنت اور احکام شریعت کا پورا پورا التزام اور اہتمام ملحوظ رکھتے تھے، اتباع سنت کے غیر معمولی اتباع ہی کی بنا پر سنن کی تالیف و ترتیب کی تھی، حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں: وھی دالة علی عمله وعلمه وتبحره واطلاعه واتباعه للسنة فی الفروع والاصول[۲]۔

تصنیفات اس زمانہ میں کتابوں کی اشاعت کی یہ سہولتیں حاصل نہ تھیں، اس لیے آج قدماء کی بہت سی کتابوں کا صحیح علم اور ٹھیک پتہ چلانا بڑا مشکل کام ہے، عموماً

[۱] و [۲] تاریخ ابن کثیر ج ۱۱ ص ۵۲

ان ہی کتابوں کا حال معلوم ہو سکتا ہے جو شائع ہو چکی ہیں، یا جن کے نسخے امتداد زمانہ کے باوجود محفوظ رہ گئے ہیں، یا پھر تذکرہ و تراجم کی کتابوں میں ان کا نام آیا ہے، لیکن تاریخ وطبقات کی کتابوں کا حال یہ ہے کہ ان میں ائمہ اور اصحاب فن کے حالات ہی کم ملتے ہیں اور تصنیفات کا یا تو ذکر ہی نہیں یا برائے نام ذکر ہوتا ہے، اس لیے ابن ماجہ کی صرف ان ہی کتابوں کا سراغ لگایا جا سکتا ہے جن کا ذکر تاریخ و تراجم کی کتابوں میں ہے اور یہ صرف چند غیر متعین تصنیفات ہیں۔

سنن ابن ماجہ: یہ حدیث کی مشہور اور معرکۃ الآراء کتاب ہے، جس کا تفصیلی تعارف آخر میں کیا جائے گا،

اس کے علاوہ امام موصوف کی کسی متعین تصنیف کا حال نہیں معلوم ہوتا، البتہ عام طور سے اصحاب سیر و تذکرہ نے تفسیر و تاریخ میں آپ کی ایک ایک کتاب کا ذکر کیا ہے، علامہ ابن خلکان فرماتے ہیں:

ولہ تفسیر القرآن الکریم وتاریخ ملیح[1]

امام ابن ماجہ نے تفسیر قرآن اور ایک بہترین تاریخ کی کتاب لکھی ہے۔

ابو یعلیٰ کہتے ہیں:

ولہ مصنفات فی السنن و التفسیر والتاریخ[2]

ان کی سنن، تفسیر اور تاریخ میں تصنیفات ہیں،

تذکرہ نگاروں کے ان بیانوں سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ سنن کی طرح تفسیر اور تاریخ کی کتابیں بھی اہم تھیں، اس لیے کہ ان کے ساتھ یہ فقرہ بھی ملتا ہے کہ وکان عارفاً بھذا الشان۔

[1] تاریخ ابن خلکان ج ۲ ص ۴۸۲ [2] تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۵۳۱

تاریخ میں انکی تصنیف کے موضوع کی وضاحت حافظ ابو زرعہ کے اس بیان سے ہوتی ہے،

ورأیت لہ بقزوین تاریخا علی الرجال والامصار من عھد الصحابۃ الی عصرہ[1]

میں نے قزوین میں رجال وامصار کے موضوع پر ابن ماجہ کی تاریخ میں ایک کتاب دیکھی جو عہد صحابہ سے لیکر انکے زمانہ تک کے لوگوں کے حوال

لیکن تفسیر اور تاریخ کی یہ دونوں کتابیں نایاب ہیں۔

وفات امام صاحب کی وفات کے متعلق تمام اصحاب سیر و تذکرہ کا اتفاق ہے کہ ۶۴ سال کی عمر میں دوشنبہ ۲۲ رمضان المبارک ۲۷۳ھ کو ہوئی اور سہ شنبہ کے دن تجہیز و تکفین عمل میں آئی، نماز جنازہ آپ کے بھائی ابوبکر نے پڑھائی اور تدفین کی خدمت وہ اور انکے علاوہ ایک اور بھائی ابو عبداللہ اور صاحبزادے عبداللہ نے انجام دی۔

مصر کے ایک جدید اور جید عالم عبدالعزیز خولی نے ولادت کا سال ۲۰۷ھ اور وفات کا ۲۷۵ھ قرار دیا ہے،[2] اور حافظ ابن حجر نے بھی "قیل" کہکر اس قسم کا ایک قول نقل کیا ہے،[3]

امام ابن ماجہ کی وفات ایک بڑا علمی سانحہ تھا، اس لیے بعض شعراء نے اس واقعہ سے متاثر ہو کر نہایت پردرد اور طویل مرثیے لکھے، محمد بن اسود قزوینی کے مرثیہ کا پہلا شعر ہے:

لقد اوھی دعائم عرش علم — وضعضع رکنہ فقد ابن ماجۃ

بلاشبہ ابن ماجہ کی وفات سے علم کے پایۂ تخت کا ستون کمزور ہوگیا اور اس میں زلزل آگیا

یحییٰ بن زکریا طرائفی کہتا ہے:

ایا قبر ابن ماجۃ غثت قطرا — مساءً بالغداۃ وبالعشی[4]

اے ابن ماجہ کی قبر تو صبح و شام باران رحمت سے سیراب ہو،

[1] شروط الائمۃ الستۃ ص ۹ [2] مفتاح السنۃ ص ۱۰۱ [3] تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۵۳۱ [4] ایضاً

سنن ابن ماجہ

ابن ماجہ کی زندگی کا سب سے بڑا اور اہم کارنامہ سنن کی ترتیب و تالیف ہے، اسی کے ذریعہ ان کو دائمی مقبولیت اور عام شہرت نصیب ہوئی، اگر امام صاحب کا اس کے علاوہ کوئی اور علمی، دینی اور تصنیفی کارنامہ نہ ہوتا تب بھی تنہا سنن ابن ماجہ ان کی علمی عظمت اور دینی فضیلت کے لیے کافی تھی، آیندہ سطور میں اس کتاب کی اہمیت، خصوصیت اور اس سے متعلق دوسرے مسائل و مباحث پر بالتفصیل بحث کی جائے گی،

سنن میں احادیث اور ابواب کی تعداد

سنن ابن ماجہ میں ۳۲ کتابیں (اہم مباحث) اور ۱۵۰۰ ابواب ہیں، اور پورا مجموعہ ۴۰۰۰ حدیثوں پر مشتمل ہے،[1]

کیا سنن ابن ماجہ صحاح میں داخل نہیں ہے

اگرچہ سنن ابن ماجہ وہ مقام اور شہرت نہ حاصل کر سکی جو صحیحین یا ترمذی، ابوداؤد اور نسائی کو حاصل ہے، اور نہ اسے ان کے مساوی قرار دیا جا سکتا ہو مگر اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ حدیث کی جو کتابیں زیادہ معتبر اور مستند سمجھی جاتی ہیں اور جن کی صحت و جودت اور شہرت و مقبولیت پر امت کا اتفاق ہے ان میں ابن ماجہ کی سنن بھی داخل ہے،

البتہ اس امر میں اختلاف ہے کہ صحاح ستہ میں حدیث کی کون کون سی کتابیں شامل ہیں، پانچ کتابوں یعنی جامع بخاری، صحیح مسلم، سنن ابی داؤد، سنن نسائی اور جامع ترمذی پر تو سب کا اتفاق ہے، لیکن چھٹی کتاب کے متعلق اختلاف ہے، جمہور علماء کے نزدیک صحاح کی چھٹی کتاب ابن ماجہ کی سنن ہے، اور بوجوہ یہی خیال صحیح معلوم ہوتا ہے، لیکن بعض لوگوں نے اس کی جگہ موطاء امام مالک اور بعض نے سنن دارمی کو دی ہے، اول الذکر یعنی موطاء کی اہمیت، عظمت، مقبولیت اور صحت میں کسے کلام ہو سکتا ہے، لیکن وہ حدیث کی طرح

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۱۰ البدایہ والنہایہ ج ۱۱ ص ۵۲ و بستان المحدثین ص ۱۱۲ نیز الحطہ ص ۱۱

فقہ، آثار اور فتاوائے صحابہ سب کا مجموعہ ہے، اس میں مرفوع، موقوف اور مرسل ہر طرح کی روایتیں پائی جاتی ہیں، جو عموماً صحیح ہیں، لیکن اس کی موجودہ شکل و نوعیت میں اس کا حدیث کی دوسری مروج اور متداول کتابوں سے مقابلہ کرنا غیر مناسب ہے، اس سے اس کی عظمت و برتری میں کوئی فرق نہیں آتا، اس کا خود ایک مقام و مرتبہ ہے، جس میں حدیث کی کوئی کتاب اسکی شریک و سہیم نہیں، موطاء کی قدامت و عظمت اور صحت کی بنا پر بعض علماء نے اسے صحاح تو درکنار صحیحین سے بھی بالاتر قرار دیا ہے، مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم نے حیات امام مالک میں بالتفصیل اس کے وجوہ تحریر کیے ہیں، اور محققین قدماء نیز حضرت شاہ عبد العزیز صاحبؒ کا بھی یہی مسلک ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی نے حجۃ اللہ البالغہ میں کتب حدیث کے چار طبقات کا ذکر کرتے ہوئے پہلے طبقہ میں موطاء اور صحیحین کو شمار کیا ہے، اور موطاء کو ان سے بھی فائق قرار دیا ہے، پس حدیث کی مروج و متداول کتابوں سے اس کا تقابل صحیح نہیں ہے، سنن دارمی کی اہمیت و عظمت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا ہے اور اس کی صحت و جودت بھی مسلم ہے لیکن سنن ابن ماجہ کا درجہ اس سے کہیں بلند ہے، اور اس کے مقابلہ میں اس کی خصوصیات زیادہ ہیں، اسی لیے یہ قول شاذ کی حیثیت رکھتا ہے اور بہت کم محدثین کی طرف منسوب ہے، اس کے برعکس سنن ابن ماجہ کو عام طور سے محدثین اور جمہور علمائے اسلام نے صحاح ستہ میں شامل کیا ہے، اس کے بارہ میں بعض مشہور اصحاب سیر و تراجم اور اجلہ علماء کی رائیں یہ ہیں،

ابن طاہر مقدسی (متوفی ۵۰۷ھ) نے شروط الائمۃ الستۃ میں، حافظ عبد الغنی نے کتاب الاکمال فی اسماء الرجال میں سنن ابن ماجہ کو صحاح ستہ میں شامل کیا ہے، اور علامہ عبد العزیز خولی فرماتے ہیں کہ موطاء کے بجائے سنن ابن ماجہ کو صحاح ستہ میں ان لوگوں نے اس لیے شامل کیا ہے کہ موطاء کے برعکس اس میں کثرت سے ائمہ خمسہ پر زوائد اور اضافے موجود ہیں،[1]

[1] مفتاح السنۃ ص ۱۰۱

ابن خلکان اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں:

وکتابه فی الحدیث احد الصحاح الستة[1]

ابن ماجہ کی سنن صحاح ستہ میں سے ایک ہے،

ابو الفداء اور صاحب شذرات بھی ابن خلکان کے اس قول کی تائید و تصویب کرتے ہیں۔

مراۃ الجنان میں علامہ ذہبی سے بھی یہی مسلک منقول ہے

وکتابه فی الحدیث احد الکتب الستة التی هی اصول الحدیث وامهاته[2]

اور ان کی کتاب حدیث کی ان چھ کتابوں میں شمار ہوتی ہے جو امہات فن میں شامل ہیں،

صاحب اعلام تحریر فرماتے ہیں:

وصنف (سنن ابن ماجة -) وهو احد الصحاح الستة[3]

اور انھوں نے سنن کی تالیف کی جو مطبوع اور صحاح ستہ میں شامل ہے.

ہندوستان میں حدیث کے ممتاز اور مشہور عالم حضرت شاہ عبد العزیز صاحب دہلوی رح فرماتے ہیں:

"صاحب تصانیف مفیدہ، و نافعہ است ازاں جملہ است ایں سنن کہ یکے از صحاح ستہ است"[4]

نواب صدیق حسن خاں صاحب رقمطراز ہیں:

قال الشیخ عبد الحق الدهلوی کتابه واحد من الکتب الستة التی یقال له الاصول الستة

حضرت شاہ عبد الحق دہلوی کا ارشاد ہے کہ ابن ماجہ کی سنن کا شمار ان اسلامی کتب میں ہوتا ہے جنھیں اصول ستہ، کتب ستہ اور

[1] تاریخ ابن خلکان ج ۲ ص ۲۸۴ [2] مراۃ الجنان ج ۲ ص ۸۸ [3] الاعلام ج ۳ ص ۱۰۰۲ [4] بستان المحدثین ص ۱۱۲

والکتب الستة والصحاح الستة قلت والامهات الستة واذا قال المحدثون رواه الجماعة یریدون به روایة هذه الرجال الستة فی تلک الکتب الستة واذا قالوا رواه الاربعة فمرادهم هذه الاربعة غیر البخاری ومسلم[1]

صحاح ستہ کہا جاتا ہے، اور میں کہتا ہوں کہ انھیں امہات ستہ بھی کہا جاتا ہے اور جب محدثین رواہ الجماعۃ کہتے ہیں تو ان کے اس قول سے یہی چھ اشخاص مراد ہوتے ہیں جنھوں نے کتب ستہ کی روایت کی ہے اور جب رواہ الاربعہ کہتے ہیں تو انکی مراد امام بخاری اور امام مسلم کے بجائے ان چار افراد سے ہوتی ہے۔

اس کے علاوہ متعدد اصحاب فکر و علم اور اہل نظر مثلاً صاحب کشف الظنون، شاہ عبد الحی، مولانا سید ابو الوزیر احمد حسن اور محمد عبد العزیز خولی وغیرہ نے اس کے صحاح ستہ میں ہونے کا تذکرہ کیا ہے، اور ان کے انداز بیان سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی موطا، وغیرہ کے بجائے سنن ابن ماجہ ہی کو صحاح ستہ میں شامل سمجھتے ہیں،

اس تفصیل سے پوری وضاحت ہوگئی کہ کثرت آرا، سنن ابن ماجہ کے حق میں ہے لیکن کچھ لوگوں کی رائے موطا امام مالک کے حق میں اور ایک شاذ قول سنن دارمی کے متعلق بھی ہے، جیسے شاہ عبد الحق صاحب نے مقدمہ مشکوٰۃ اور علامہ عبد العزیز خولی نے مفتاح السنۃ میں بیان کیا ہے۔ اس لیے صحیح اور مختار قول یہی ہے کہ سنن ابن ماجہ بھی صحاح ستہ میں شامل ہے،

سنن کی خصوصیات ذیل میں اسکی بعض نمایاں اور مشہور خصوصیتوں کا تذکرہ کیا جاتا ہے،

(۱) علمائے امت نے اسے من السنن المشهورة والامهات الستة والاصول الستة، والکتب الستة کا ممتاز ترین نام دیا ہے، یعنی اسے حدیث کی ان چھ کتابوں میں شمار کیا گیا ہے جو اپنی صحت، شہرت، جودت، حجیت اور استناد کے لیے معروف ہیں، اور ان میں بہت کم ضعیف روایات ہیں

[1] الحطہ فی ذکر الصحاح الستہ ص ۱۱۰

(۲) یہ صحیح ہے کہ صحاح کی دوسری کتابوں کی طرح اس کو شہرت نہ ہو سکی، لیکن اس کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ اس میں بعض ایسی خصوصیات ہیں جو صحاح اور حدیث کی دوسری کتابوں میں نہیں ملتیں، بعض علماء نے لکھا ہے کہ

ومن اراد ما اشتمل علی المتون	اور جو شخص بہت زیادہ متون پر مشتمل اور اس
الکثیرة انفرد بھا من غیرہ	خصوصیت کے لحاظ سے دوسری کتب حدیث
من الکتب فابن ماجة[1]	سے منفرد کتاب کا جویا ہو اسے ابن ماجہ کی
	سنن کا مطالعہ کرنا چاہیے،

چنانچہ حافظ ابوزرعہ بھی فرماتے ہیں:

اظن ان وقع ھذا فی ایدی	میرا خیال ہے کہ اگر یہ جامع لوگوں کے
الناس تعطلت ھذہ الجوامع	ہاتھوں میں پہنچی تو دوسرے جوامع اور
او اکثرھا[2]	مصنفات معطل ہو جائیں گے،

عبد العزیز خولی لکھتے ہیں:

وانما قدموا سنن ابن ماجة	علماء نے سنن ابن ماجہ کو موطا پر اس لیے
علی الموطاء لکثرة زوائدہ	ترجیح دی ہے کہ اس میں موطا کے
علی الخمسة بخلاف الموطاء[3]	برخلاف اصحاب خمسہ پر بکثرت زوائد ہیں،

(۳) سنن ابن ماجہ حسن ترتیب و تالیف میں خاص امتیاز رکھتی ہے، اس کی ترتیب میں بڑے اختصار و ایجاز سے کام لیا گیا ہے، اور روایات کے نقل میں تکرار نہیں پائی جاتی حضرت شاہ عبد العزیزؒ فرماتے ہیں:

---

[1] حواشی السندی ص ۵۱ [2] تذکرة الحفاظ ج ۲ ص ۲۱۰ [3] مفتاح السنة ص ۱۰۱

"فی الواقع از حسن ترتیب و سرد احادیث بے تکرار و اختصار انچہ کہ این کتاب دارد ہیچ یک از کتب ندارد"[1]

(۴) دوسری کتابوں کے مقابلہ میں سنن ابن ماجہ میں ثلاثیات کی کثرت ہے، ثلاثیات سے مقصود یہ ہے کہ راوی اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان صرف تین راوی ہوں چنانچہ امام بخاری کی ثلاثیات صرف بارہ اور امام دارمی کی پندرہ ہیں، نواب صدیق حسن خانصاحب تحریر فرماتے ہیں:

ولہ عدة احادیث ثلاثیات	سنن ابن ماجہ کی متعدد روایات ثلاثیات
اوردھا فی سننہ	کی قسم میں ہیں،

(باقی)

---

[1] بستان المحدثین ص ۱۱۲ [2] الحطہ فی ذکر الصحاح الستة ص ۱۱۰

ہندوستان کے عہد وسطیٰ کا فوجی نظام

اس کتاب میں ہندوستان کے عہد وسطیٰ خصوصاً مسلمان حکمرانوں کے دور کے فوجی و حربی نظام، آلاتِ حرب، آتشیں اسلحے، فوجی لباس، فوجوں کی تعداد، تنخواہوں کے نظام، بحری بیڑے، کوچ، کیمپ کے سامان، صف آرائی، میدانِ جنگ محاصرہ، قلعے، چھاؤنیاں اور فوجی تربیت وغیرہ پر بڑی دیدہ ریزی و دیدہ وری سے معلومات فراہم کیے گئے ہیں۔

ضخامت: ۴۹۰ صفحے قیمت: ۔/۴۰

مرتبہ: سید صباح الدین عبد الرحمٰن، ایم، اے۔

منیجر

مقالہ نمائے شبلیؔ

از جناب محمد بشیر الحق صاحب دیسنوی

مذکورۂ بالا عنوان سے احمد اسحٰق صاحب نعمانی نے ایک مضمون لکھا تھا جو دلی کے رسالہ آجکل جنوری ۱۹۶۰ء میں شائع ہوا تھا، مگر وہ ناقص تھا، اس میں بہت سے ماخذ رہ گئے تھے، اس مضمون میں ان ماخذوں کو یکجا کر دیا گیا ہے،

نمبر	مقالہ نگار	مقالہ	رسالہ / کتاب	صفحہ	تاریخ اشاعت
۱	ابو الحسنات، سید غلام محی الدین	شبلی نعمانی	اردو کے اسالیب بیان	۸۰	۱۹۲۷ء
۲	ابو ظفر عبد الواحد	مقالات شبلی	حیدر آباد کے ادیب (انتخاب نثر)	۱۴	دسمبر ۱۹۵۵ء
۳	احسن مارہروی	نمبر ۵۳ - سیرۃ النبی حصہ اول مولوی شبلی نعمانی	تاریخ نثر اردو حصہ اول تاریخی منشورات اردو	۲۵۱	۱۳۴۸ء
۴	احمد - اسرائیل مینائی	مینا بازار (در ذکر نثاران اردو)	شش ماہی رسالہ نظام ادب حیدر آباد بابت دسمبر ۱۹۴۲ء	۳۱ لغایت ۶۹	۱۹۴۲ء
۵	احمد - کلیم الدین	شبلی	اردو تنقید پر ایک نظر	۱۱۲	۱۹۵۷ء
۶	آزاد - ابو الکلام وغیرہ	شبلی	آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی بروایت عبدالرزاق ملیح آبادی	۳۱۱ ۳۹۹	۱۹۵۸ء اپریل

نمبر	مقالہ نگار	مقالہ	رسالہ / کتاب	صفحہ	تاریخ اشاعت
۷	اسمٰعیل شیخ محمد (مرتب)	خطوط حالی بنام شبلی نعمانی	مکاتیب حالی	۳۵ ۱۲۸	۱۹۵۰ء
۸	آفتاب احمد صدیقی - ڈاکٹر	شبلی یک دبستان	شبلی یک دبستان	-	مکتبہ عارفین ڈھاکہ
۹	افضل علی میر متخلص بہ ضو	موازنہ انیس و دبیر کے رد میں	ردّ الموازنہ	-	۱۳۲۵-۲۶ء
۱۰	اقبال - سر شیخ محمد	شبلی و حالی (نظم)	بانگ درا	۲۴۸	تاریخ اشاعت پنجم جنوری ۱۹۴۲ء
۱۱	اکرام - شیخ محمد ایم اے	(۱) حیات شبلی پر تنقید و تبصرہ	شبلی نامہ	-	۱۹۴۶ء
		(۲) شبلی	موج کوثر	۲۵۰	فیروز اینڈ سنز لاہور سنہ اشاعت درج نہیں ہے
۱۲	امین زبیری مارہروی - محمد	حیات شبلی پر بے لاگ اور محققانہ تبصرہ	ذکر شبلی		۱۹۴۶ء
۱۳	ایک طالب علم (عبد الماجد دریابادی)	(۱) الکلام مولانا شبلی پر ایک نظر تنقیدی نظر نمبر ۱	رسالہ الناظر لکھنؤ ماہ مارچ ۱۹۱۰ء ایضا		۱۹۱۰ء
		(۲) ایضاً نمبر ۲	ایضاً ماہ اپریل ۱۹۱۰ء		
		(۳) ایضاً نمبر ۳	ایضاً ماہ جون ۱۹۱۰ء		
		(۴) ایضاً نمبر ۴	ایضاً ماہ اگست ۱۹۱۰ء		
		(۵) ایضاً نمبر ۵	ایضاً ماہ اکتوبر ۱۹۱۰ء		
۱۴	براؤن، ای، جی	شبلی نعمانی	لٹریری ہسٹری آف پرشیا (انگریزی) جلد سوم	۱۰۸-۲۶۱ ۲۶۵-۲۶۷ ۲۶۹-۲۷۱ ۲۷۳-۲۷۴ ۲۸۰-۲۸۹ ۲۹۱-۲۹۲ ۲۹۳	۱۹۵۱ء (ایڈیشن)

نمبر	مقالہ نگار	مقالہ	رسالہ / کتاب	صفحہ	تاریخ اشاعت
۱۵	بنے میاں۔ سید محمد عرف	الفاروق پر ریویو	الفرق جلد اول و دوم	-	۱۹۰۷ء برلاسمہ پریس مراد آباد
۱۶	بھاجی والا، رستم پیستوں جی	شبلی اور عمر خیام	مولانا شبلی اینڈ عمر خیام (انگریزی)	-	۱۹۳۲ء
۱۷	جمیل احمد بریلوی۔ محمد	علامہ شبلی نعمانی	اردو شاعری کی مختصر تاریخ	۱۹۲	۱۹۴۰ء
۱۸	حافظ۔ محمود شیرانی پروفیسر	شعر العجم	تنقید شعر العجم	.	۱۹۴۲ء
۱۹	حالی، الطاف حسین مولانا	(۱) ذکر شبلی در نامہ حالی بنام سید سلیمان ندوی	رسالہ معارف اعظم گڈھ جلد ۲ ۷ جنوری ۱۹۱۸ء	۵۶	۱۹ء
		(۲) ذکر شبلی در نامہ حالی بنام حامد شبلی	رسالہ معارف اعظم گڈھ جلد ۲ ۱۱ مئی ۱۹۱۸ء	۵۸	۱۹۱۸ء
۲۰	سکسینہ، رام بابو	شبلی نعمانی	ہسٹری آف اردو لٹریچر (انگریزی)	۲۱-۲۸۷	۱۹۲۷ء
۲۱	سندیلوی اشجاعت علی و ناظر کاکوروی	(۱) شبلی	مطالعۂ شبلی	-	-
		(۲) انشائے شبلی	رسالہ فروغ اردو لکھنؤ ستمبر ۱۹۵۹ء		۱۹۵۹ء
۲۲	عطا محمد	(۱) تنقید الکلام نمبر ۲ کی اصلاح	رسالہ الناظر لکھنؤ ماہ جولائی ۱۹۱۰ء		۱۹۱۰ء
		(۲) تنقید الکلام نمبر ۳ کی اصلاح	ایضاً ماہ ستمبر ۱۹۱۰ء		
		(۳) تنقید الکلام نمبر ۴ کی اصلاح	ایضاً ماہ نومبر ۱۹۱۰ء		
۲۳	عبدالرزاق حیدرآبادی	شبلی	کلیات اقبال	۴۵ (دیباچہ)	۱۹۲۴ء
۲۴	عبدالرزاق کانپوری	(۱) شبلی نعمانی	البرامکہ طبع پنجم	۹	۱۹۳۸ء ۱۳۵۷ھ
		(۲) شبلی	یاد ایام	۶۰	۱۹۴۷ء

نمبر	مقالہ نگار	مقالہ	رسالہ / کتاب	صفحہ	تاریخ اشاعت
۲۵	عبدالرزاق ملیح آبادی	علامہ شبلی نعمانی	ذکر آزاد	۲۱۷	فروری ۱۹۶۰ء
۲۶	عبدالعزیز رحیم آبادی، مولانا	تنقید سیرۃ النعمان	حسن البیان فیما فی سیرۃ النعمان	-	۱۳۱۱ھ
۲۷	عبداللطیف۔ سید	شبلی نعمانی	The influence of English lite on urdu literatur	۷۴، ۸۰، ۸۱-۸۹، ۹۱-۹۲، ۹۳-۹۴، ۱۰۳، ۱۱۵، ۱۱۷، ۱۲۰، ۱۲۱، ۱۲۴، ۱۲۹	۱۹۲۴ء
۲۸	عبدالقادر سروری	حصہ سوئم، عصر اصلاح آزاد، حالی، شبلی	جدید اردو شاعری	۱۳۰	۱۹۳۲ء
۲۹	عبداللہ یوسف علی آئی سی ایس	تنقید الکلام نمبر ۱ پر مختصر خیالات	رسالہ الناظر لکھنؤ ماہ مئی ۱۹۱۰ء	.	۱۹۱۰ء
۳۰	عبداللطیف اعظمی (جامعہ)	مولانا شبلی کی ادبی حیثیت	مولانا شبلی کا مرتبہ اردو ادب میں	.	۱۹۴۵ء
۳۱	فوق رضوی، چودھری سید نذیر الحسن	مضامین جواب موازنۂ انیس و دبیر	المیزان	.	۱۹۰۸ء
۳۲	قادری، حامد حسن	علامہ شبلی نعمانی	داستان تاریخ اردو	۶۱۰ تا ۶۴۴	۱۹۵۷ء (طبع دوم)
۳۳	قریشی۔ نسیم	شبلی نعمانی	اردو ادب کی تاریخ	۱۷۱ تا ۱۷۴	۱۹۵۵ء
۳۴	قریشی ڈاکٹر وحید	شبلی	شبلی کی حیات معاشقہ	.	.
۳۵	کلیم۔ محبوب الرحمٰن	مولانا شبلی اور ان کی شاعری	رسالہ معارف اعظم گڈھ۔ دسمبر ۱۹۱۸ء	۳۱۳	۱۹۱۸ء
۳۶	گرہیم بیلی۔ ٹی	شبلی ۲۲۰	اردو لٹریچر (انگریزی)	۸۸	۱۹۳۲ء
۳۷	مہدی بیگم (مرتب)	مولانا شبلی کے نام	مکاتیب مہدی	۴	۱۹۳۸ء

نمبر	مقالہ نگار	مقالہ	رسالہ/ کتاب	صفحہ	تاریخ اشاعت
۳۸	ندوی، سید سلیمان، مولانا	(۱) مولانا شبلی کے مرض الموت کے حالات، وفات اور آخری احوال پر مسلسل مضامین	اخبار زمیندار لاہور، فروری ۱۹۱۵ء		۱۹۱۵ء
		(۲) مولانا شبلی کے مختصر حالات زندگی	رسالہ معارف اعظم گڈھ، اگست ۱۹۱۶ء		۱۹۱۶ء
		(۳) علامہ شبلی کی تیسری برسی	رسالہ معارف اعظم گڈھ نومبر ۱۹۱۷ء		۱۹۱۷ء
		(۴) مولانا شبلی مرحوم کی ابتدائی تحریر کا نمونہ	رسالہ معارف اعظم گڈھ ستمبر ۱۹۱۸ء		۱۹۱۸ء
		(۵) روزنامچہ مولانا شبلی نعمانی	رسالہ معارف اعظم گڈھ ستمبر ۱۹۱۸ء		۱۹۱۸ء
		(۶) حیات شبلی	حیات شبلی		۱۹۴۳ء
۳۹	ندوی نجم الہدیٰ، سید مولانا	مضمون "سید صاحب کی یادیں" شبلی کا تذکرہ	رسالہ معارف اعظم گڈھ ماہ نومبر ۱۹۵۹ء	۳۲۵ تا ۳۵۰	۱۹۵۹ء
۴۰	نیاز فتح پوری	"مولانا آزاد کی صحافتی عظمت" میں ذکر شبلی	رسالہ آجکل ماہ اگست ۱۹۵۸ء (ابو الکلام نمبر)	۱۸	۱۹۵۸ء
۴۱	وصی احمد بلگرامی	شبلی مع استدراک نیاز فتح پوری	ملک خطا کے شہزادے		۱۹۴۴ء
۴۲	یحییٰ، تنہا، محمد	شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی	سیرۃ المصنفین جلد دوم طبع اول	۴۰۲ تا ۴۸۸	۱۹۲۸ء

آثارِ علمیہ

مکاتیبِ سلیمانی

بنام

مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی

اعظم گڈھ

حبیب مکرم، دام فضلکم

السلام علیکم، امید ہے کہ آپ بخیریت ڈھاکہ پہنچ گئے ہوں گے، میں سہارنپور سے دن کے ایکسپریس سے آیا ڈاک سے نہیں، کہ وہ ۲ بجے رات کو چلتی تھی، بہر حال میرا ارادہ تھا کہ ڈاک کا وقت لکھنؤ پہنچنے کا دریافت کر کے میں اسٹیشن پر حاضر ہوں مگر میرے پاؤں میں کوئی رگ ایسی چڑھ گئی تھی کہ چلنے میں تکلیف ہو گئی تھی، اس لیے معذور رہا،

تھانہ بھون میں آپ کے الطاف کریمانہ نے مجھے مرہونِ منت کیا، جزاکم اللہ تعالےٰ خیراً، عنایت نامہ جو پہلے لکھا گیا تھا وہ واپسی کے بعد ملا۔ دیرٹھا مسئلہ کی نسبت آپ کی رائے معلوم ہوئی، آپ کا خط پہلے ملتا تو حسب ایما کتاب الطہورین لیتا جاتا مگر یہ موقع نکل گیا، آپ کی رائے کے لیے میں اس کا پہلا صفحہ نقل کر کے بھیجتا ہوں کہ اندازہ ہو اور آپ اس کی حقیقت کا پتہ لگا سکیں، کبیری کی عبارت مطلوبہ سنن عشاء کے متعلق حسب ذیل ہے:۔

اما الاربع غلماء وی عن البراء بن عازب۔ قال رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم

من صلے قبل العشاء اربعاً کانما تھجد من لیلۃ ومن صلاھا بعد العشاء کان کمثلہن من لیلۃ القدر، رواہ ابن سعید بن منصور فی سنۃ ورواہ البیھقی من قول عائشۃ والنسائی والدارقطنی من قول کعب ص۳۴ نصب الرایۃ عسقلانی ص۱۱۹ میں بھی سعید بن منصور کے حوالہ سے وقبل العشاء اربعاً ہے، اگر زیلعی میں اسی روایت میں قبل العشاء کے بجائے قبل الظہر ہے، اور بیہقی میں بھی قبل الظہر ہے، معلوم نہیں صحیح کیا ہے، گر تہجد کے ثواب کی مناسبت قبل العشاء ہی سے ہوگی، قبل الظہر سے کیا ہوگی، مولانا عبدالحئی صاحب فرنگی محلی نے بھی حاشیہ ہدایہ سے قبل العشاء اربعاً سعید بن منصور کا حوالہ دیا ہے،

خیر یہ تو ایک اناڑی کی بات چیت ہے، اب آپ جانیں اور تحقیق روایات،

"کتاب الطواسین کا پہلا باب مع فاتحہ[۱]"

دوسرے اور تیسرے باب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حقایق معراج اور پھر دوسرے انبیاء کی حقیقت و معرفت اسی طرز عبارت میں بیان کی گئی ہے، چھٹا باب طاسین الازل و الالتباس کا ہے آغاز، فی صحۃ الدعا بعکس المعانی.

ماصحت الدعوی لاحد، الا لابلیس و احمد صلعم، غیر ان ابلیس سقط من العین و احمد صلعم کشف لہ عن عین الیقین قیل لابلیس اسجد ولاحد انظر هذا اما سجد و احمد ما نظر ما التفت یمیناً و شمالاً ما زاغ البصر وما طغی آخر میں وہی بیان ہے کہ شیطان عارف تھا کہ خدا کو چھوڑ کر دوسرے کو سجدہ نہیں کیا، اسی قسم کے ۱۱ بابوں میں رسالہ ختم ہے، اگر چاہیں تو آپ نقل کرالیں، یہ آسان ہے،

والسلام

سید سلیمان، ۲۵، نومبر ۱۹۴۲ء

---

[۱] اس کے بعد پورا باب نقل کیا گیا ہے،

دارالمصنفین اعظم گڈھ

محب مکرم، رفع اللہ تعالیٰ شانکم

السلام علیکم، عنایت نامہ کا شکریہ، عتاب ہی سہی پھر بھی یہ خطاب میری سعادتمندی کا نشان تھا کہ آپ کے عربی منظومات میں میرے ذریعہ چند سطروں کا مفید اضافہ ہوجاتا،

بعض مدرسین (التبتین للواحد) نے یہ پھیلایا ہے کہ میں مدرسہ کو دیوبند بنانا چاہتا ہوں اور حضرت والا سے میرا تعلق ان پر شاق ہے، جس سے طلبہ میں یہ غلط فہمی پھیلی ہوئی ہے کہ میں عنقریب مدرسہ سے علوم جدیدہ کی تعلیم روک دوں گا، اور طلبہ میں موجودہ مہتمم صاحب کی سخت گیری کی شکایتیں پھیلائی گئی ہیں، اخبارات میں کہیں کہیں مضامین ان لوگوں نے چھپوائے ہیں، مگر میں نے ابھی تک خاموشی کے سوا ان کا جواب نہیں دیا ہے، بحمد اللہ کہ میرا دل مطمئن ہے.

نسخہ مل گیا، شکریہ قبول فرمائیے.

میرا ارادہ اس مئی میں تھانہ بھون کا تھا، مگر بعض وجوہ سے نہ جاسکا، سخت گرمی پڑ رہی ہے، کچھ دن کے لیے وطن کا قصد ہے،

آپ ڈھاکہ سے بُعد مسافت کی وجہ سے گھبرا گئے ہیں، سنا تھا کہ فتحپوری والے آپکے مشتاق ہیں، مگر ان مدرسوں میں فسادات آئے دن اٹھا کرتے ہیں، اس سے جی ڈرتا ہے،

معارف طلبہ کے نام جاری کر دیا گیا ہے۔

والسلام

سید سلیمان، ۲۴ مئی ۱۹۴۳ء

اعظم گڈھ

مولانا المکرم زاد فضلکم

السلام علیکم، والا نامہ مشتمل بر تحقیق مسئلہ اسم اعظم وارد ہوا، رسید پہلے دے چکا ہوں

میرے ان الفاظ پر کہ اسم اعظم کا تخیل جاہلانہ اور غیر ثابت بالشرع ہے، آپ نے تنبیہ فرمائی ہے، اس اخلاص کا شکریہ پھر آپ نے اپنی تحقیقات سے نوازا ہے، یہ میرے مزید علم کا باعث ہوا،

جواباً عرض ہے، میں نے جاہلانہ اور غیر ثابت بالشرع اس تخیل کو کہا ہے جو عوام میں پھیلا ہوا ہے، اور جس کا آغاز یہود سے ہوا ہے اور جو مسلمانوں میں موجود ہے، اور وہ تخیل یہ ہے کہ اسم اعظم ایک خاص اسم الٰہی ہے، جو کسی کو نہیں معلوم، اگر کسی کو وہ معلوم ہو جائے تو وہ اس کو پڑھ کر جو چاہے کر سکتا ہے، جیسا کہ بابل کے قصہ میں مشہور ہے کہ زہرہ عورت ہاروت و ماروت فرشتوں سے اسم اعظم کا راز سیکھ کر اور اس کو پڑھ کر (فتکلمت بہ) آسمان پر چلی گئی، اور ستارہ بن گئی، (درمنثور سیوطی جلد ۱ ص ۸۷) یا یہ کہ (الذی عندہ علم من الکتاب) سے اسم اعظم مراد ہے، آصف ابن برخیا وزیر کو یہ اسم اعظم معلوم تھا، وہ اس کو پڑھ کر فوراً تخت لے آئے (بحوالہ سابق) یعنی گویا جادو منتر کی طرح اس لفظ میں یہ خاصیت ہے کہ جس کو وہ معلوم ہو اور وہ اس کو جس غرض سے پڑھے وہ کام فوراً ہو جائے، میرے نزدیک یہ تخیل جاہلانہ اور شرعاً غیر ثابت ہے۔ یہ تھا میرا مقصود۔

احادیث میں اسم اللہ الاعظم کا لفظ آنے سے مجھے قطعاً انکار نہیں، چنانچہ دو روایتیں خود میں نے اپنے باب زیر بحث میں نقل کر دی ہیں، آپ نے قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ کی تفسیر مظہری کے حوالے سے اور بھی چند روایتیں نقل فرمائی ہیں، مشکوٰۃ شریف میں بھی بعض حدیثیں ایسی دعاؤں کے باب میں ہیں جو مستجاب ہوتی ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ اسم اللہ الاعظم کسی خاص اسم الٰہی کا مخصوص نام اور علم ہو کر آیا ہے یا صفت ہو کر آیا ہے جس کا اطلاق اللہ تعالیٰ کے ہر اسم مبارک پر ہو سکتا ہے، تو محدثین و فقہاء و صوفیاء رحمہم اللہ تعالیٰ کے مسالک اس میں مختلف ہیں، حافظ جلال الدین سیوطی نے جو رسالہ الدر المنظم فی الاسم الاعظم کے نام سے لکھا ہے، اس میں اس باب میں ۱۸ قول لکھے ہیں، جن میں سے پہلا یہ ہے:

لا وجود لہ بمعنی ان اسماء اللہ تعالیٰ کلھا عظیمۃ لا یجوز تفضیل بعضھا علیٰ بعض الی ذالک ذھب قوم منھم ابو جعفر الطبری و ابو الحسن الاشعری و ابو حاتم بن حبان و القاضی ابو بکر الباقلانی و نحوہ قول مالک وغیرہ لا یجوز تفضیل بعض الاسماء علی بعض و حمل ھؤلاء ما ورد من ذکر الاسم الاعظم علی ان المراد بہ العظیم و عبارۃ الطبری اختلف الآثار فی تعیین الاسم الاعظم والذی عندی ان الاقوال کلھا صحیحۃ اذ لم یرد فی خبر منھا انہ الاسم الاعظم ولا شیٔ اعظم منہ فکانہ تعالیٰ یقول کل اسم من اسمائی یجوز وصفہ بکونہ اعظم فیرجع الی معنی عظیم وقال ابن حبان الاعظمیۃ الواردۃ فی الاخبار المراد بھا مزید ثواب للداعی بذلک کما اطلق ذلک فی القرآن. والمراد بہ ثواب الداعی والقاری۔

دوسرا قول وہ ہے جو آپ نے لکھا ہے، والقول الثانی ان مما استاثر اللہ بعلمہ و لم یطلع علیہ احد من خلقہ کما قیل بذلک فی لیلۃ القدر و فی ساعۃ الاجابۃ و فی الصلوٰۃ الوسطیٰ۔ اس کے بعد اور اقوال ہیں جن میں اس اسم خاص کی تعیین ہے جو بہت مختلف ہیں،

شیخ عبد الحق دہلوی اشعۃ اللمعات میں تحریر فرماتے ہیں:

"و بدان کہ تحقیق دادہ شدہ است اقوال مختلفہ از علماء در اسم الاعظم و ذکر کردہ است سیوطی در رسالہ مسمیٰ بالدر المنظم فی بیان الاسم الاعظم کہ بعضے بر آنند کہ اسمائے الٰہی ہمہ اعظم اند و نیست تفضیل بعضے از آنہا بر بعضے، و نسبت کردہ می شود، ایں قول بہ شیخ ابو الحسن اشعری و قاضی ابوبکر باقلانی و جماعت غیر ایشان، و ایشان می میگویند آنجا کہ ذکر اسم اعظم واقع شدہ است مراد باسم اعظم عظیم است، و طبرانی گفتہ است کہ اختلاف کردہ شدہ است در تعیین اسم اعظم

ونزد من آنست کہ ہمہ اقوال صحیح اند زیرا کہ در ہیچ خبرے واقع نہ شدہ است کہ ایں اسم اعظم است وہمی دیگر از وے اعظم نیست گویا کہ وے قایل است کہ ہمہ اسماء اعظم تواں گفت پس اعظم راجع بمعنی عظیم گردد ابن حبان گفتہ کہ اعظمیتی کہ وارد شدہ است در اخبار مراد بآں مزید ثواب است مر داعی را بداں ومثل ایں معنی در آیات قرآنی نیز جاریست کہ قرأت بعضے از آیات موجب مزید ثواب است اگرچہ واحد ذات ہمہ عظیم اند کہ کلام خدا اند۔ وبعضے گفتہ اند کہ یقین آں در علم الٰہی است جز وے کسے نداند چنانکہ در لیلۃ القدر وساعۃ الجمعہ گفتہ اند، بعضے یقین نیز کردہ اند نظر بظاہر احادیثے کہ وارد شدہ است دراں یکے ازاں حدیث بریدہ است کہ مذکور شد کہ:

اسم الاعظم لا الٰہ الا انت الاحد الصمد الذی لم یلد ولم یولد ولم یکن لہ کفوًا احد وسیوطی از شیخ ابن حجر نقل کردہ کہ: وے گفتہ است کہ ایں قول ارجح است از حیثیت سند ۲ ص ۱۰۴

پھر آگے بڑھ کر فرماتے ہیں:

وبعضے گفتہ اند ہر اسمے از اسمائے الٰہی کہ بخواند او وا بداں بندہ بطریق حضور واستغراق چنانکہ در باطن او در انحالت غیر حق تعالیٰ نباشد ہر گرا ایں حالت دست داد مستجاب شدے دعائے او والبتہ، وایں قول از امام جعفر سلام اللہ علیہ وعلیٰ آباۂ الکرام واز شیخ جنید وغیرہ رضی اللہ عنہم منقول است وابن نعیم در حلیہ از بایزید بسطامی آوردہ کہ شخصے از وے از اسم اعظم سوال کرد۔ فرمود آنرا حدے محدود نیست آں فراغ قلب تست بوحدانیت وچوں باین حال باشی قصد کن ہر اسمے کہ باشد می روی بوے بمشرق ومغرب، واز ابی سلیمان دارانی آوردہ کہ گفت پرسیدم بعضے مشائخ را از اسم اعظم گفت دل خود را می شناسی، گفتم نعم،

گفت وقتے کہ بینی خود را کہ اقبال کردہ بجد او رقیق شد، سوال کن حاجت خود را کہ ہمیں اسم اعظم است، واز ابی الربیع سایح آوردہ کہ پرسید از وے مردے کہ گفت تعلیم کن مرا اسم اعظم گفت بنویسی بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، اطاعت کن خدا را تا اطاعت کند ترا، وگفتہ اند بسم اللہ الرحمٰن الرحیم از عارف ہمچو کن است از پروردگار تعالیٰ وتقدس واللہ اعلم۔"

حضرت سلطان الاولیاء نظام الدین کا قول خود سوال میں درج ہے:

ہر اسمے کہ خدائے تعالیٰ را بخوانی اسم اعظم است (فوائد الفواد)

شیخ محمد طاہر فتنی صاحب مجمع البحار جلد دوم لفظ عظیم کے تحت میں فرماتے ہیں:

دعا باسمہ الاعظم ہو بمعنی العظیم اذ لیس ہو بعض الاسماء اعظم لان جمیعہا عظیم وقیل بل کل اسم اکثر تعظیما فہو اعظم مما ہو اقل (ص ۴۰۰)

اب جس قول کو بھی کوئی اختیار کرے اس پر کوئی الزام نہیں آسکتا، خلاصہ یہ ہے کہ اسکا اس کے جادو منتر کے طریق کی مستقل خاصیت والے لفظ سے ہے جس کے تکلم کے ساتھ ہی اثر پیدا ہو جائے اور دعا کی حیثیت سے جس اسم الٰہی سے بھی اخلاص پیدا ہو یا اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اس کے ذریعہ سے التجا کیجائے اور وہ قبول فرمائے اس سے نعوذ باللہ انکار نہیں۔

والسلام

سید سلیمان، مورخہ ۴ر اگست ۱۹۴۴ء

دار المصنفین اعظم گڈھ

بقیۃ السلف، نفعنا اللہ تعالیٰ بعلومکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ یہ درویش بھوپال میں تھا، شب وصال کو خواب میں دیکھا کہ مولانا شبیر علی صاحب مجھ سے فرما رہے ہیں کہ حضرت والا پوری طرح صحت یاب ہو گئے ہیں،

صبح کو یہ خواب رفیق سفر مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب سے بیان کیا، وہ بھی خاموش ہو گئے، بہرحال ۲۲ تک بھوپال میں اطلاع نہیں پہنچی، ۲۳ کی دوپہر کو جب بھوپال سے لکھنؤ پہنچ کر ندوہ کے احاطہ میں داخل ہوا تو سب سے پہلے میرے بچہ سلمان نے دوڑ کر تانگہ ہی پر کہا، کل بڑی رلائی آرہی تھی، میں نے کہا کیوں، اس نے کہا حضرت تھانویؒ کی وفات کی خبر آئی تھی، یہاں لڑکوں کا جلسہ تھا، پھر تھانہ بھون کا خط لاکر دیا، جو میں نے بھوپال سے طلب خیریت کے لیے مولانا جمیل احمد صاحب کے نام بھیجا تھا، انھوں نے دوشنبہ کے دن شدت علالت، تنگیٔ نفس و ضعف بے غایت کی خبر دی تھی، اس کی پشت پر مطابق رویا مولانا شبیر علی صاحب کے وصال کا سانحہ رقم تھا انا للہ وانا الیہ راجعون

حسرت اپنی خامی و ناتمامی اور دیر رسی پر ہے، پھر بھی شکر ہے کہ محرومی نہیں رہی اور یہ بھی خدا ہی کا فضل ہے، اور میرے عقیدہ میں شیخ کا خود جذب و کشش ہے، اور اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ اس میں آپ کی "دلالت علی الخیر" اور محبی مولانا عبد الباری صاحب ندوی کی تحریص و تحریض کو بھی دخل ہے، شکر اللہ مساعیہما وجزاہما عنی خیر الجزاء"

حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ کی وفات و سوانح حیات پر ایک مضمون معارف میں لکھا ہے جو زیر طبع ہے، پہنچے گا، حضرت کا آخری ارشاد کہ حضرت کی تصانیف کے اقتباسات میں شائع کردوں، اس وقت تو ایک حکم علمی معلوم ہوا، اب جو سوچتا ہوں تو حقیقت میں مجھے اپنے بعد اپنی تعلیم کا ذریعہ بنا گئے، آخری رخصتانہ فقرہ نہیں بھولتا " جاؤ خدا کے سپرد کیا "۔ ہر چیز میں تو ابع کا رنگ تھا، مگر الفاظ میں اظہار رحم ناقصوں اور ضعیفوں کے عدم تحمل کے سبب سے نہیں ہو رہا تھا،

آپ کی امامت اور خواب امامت کا واقعہ مجھ سے مولانا زکریا صاحب سہارنپوری اور مولوی محمد حسن صاحب لکھنوی نے بیان کیا، آپ کی نعت کو میں نے دیکھا، اس وقت تک چند شعروں میں کچھ الفاظ خیال میں آئے ہیں، بقیہ عدد شعر لکھتا ہوں۔

۲۷۔ کل اہل قبور	بجائے	کل ذات قبور
۳۲۔ سجدات	"	خضعت
۳۳۔ اذ دانت	"	ذانت
۸۸۔ تالف	"	بوحدۃ
۱۰۴۔ الموفور		المفطور

۱۹۵ صعق بکم اللہ فوق الطور (گو اول مفتعلن ہو رہا ہے، مگر جائز ہے)

بعض الفاظ مجھے لغت میں نہیں ملے، مشکوک معلوم ہوئے آپ مزید تحقیق فرمالیں، جیسے ۸۳ میں بخریہ (الفم) ۹۲ میں بمریہ ۹۵ میں بغطیر مرثیہ عربی کا انتظار رہے گا، ایک مرثیہ مولوی سراج الحق گورنمنٹ کالج الہ آباد کا آیا ہوا ہے، میں گونگا ہو رہا ہوں، آپ کے یہ اردو شعر چوٹ کا پتہ دے رہے ہیں،

والسلام

سلیمان، ۱۴ اگست ۱۹۴۳ء

دار المصنفین اعظم گڈھ

مجی المحترم ۔۔۔ ادام اللہ تعالیٰ فیوضکم و علومکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ، میں نے آپ کی خدمت میں متواتر تین نیاز نامے لکھے ہیں، اور یہ چوتھا ہے، دوسرا مرثیہ بہت بہتر ہے، اس میں زبان بھی ہے واردات بھی ہیں، اور جذبات بھی ہیں، جزاکم اللہ ونفعنا بکم، مقامات صالحہ کا علم ہوا، اللہ تعالیٰ مزید توفیقات سے بہرہ ور فرمائیں، آپ کی ذات سے بہت کچھ توقعات ہیں اور یوں بھی آپ کو اللہ تعالیٰ نے اہل بنایا ہے، پھر حضرت والا کی نسبت سے آپ میرے مخدوم ہیں، میرا ایک عریضہ ملفوف ملا ہوگا، اس میں بعض خیالات کا

اظہار ہوگا، جس کا منشا محض خیر خواہی تھا، چونکہ آپ سے محبت اور تعلق ہے، اس لیے اس اظہار پر اپنے کو مجبور پایا،

ماشاء اللہ آپ میں علماً وعملاً اہلیتیں بجائے خود موجود ہیں، اور اگر آپ اپنے وطن میں قیام کا ارادہ فرمائیں تو بہت کچھ برکات لوگوں کو حاصل ہوں مگر اس کے لیے ابھی چندے انتظار کی ضرورت ہے، تا آنکہ مناسب حالات سامنے آجائیں اور آپ ذاتی و خانگی طور پر فارغ البال رہ سکیں، اللہ تعالیٰ وہ دن جلد لائیں،

آپ اپنا مضمون بر وفات جس کا تذکرہ آپ نے کیا ہے، جلد از جلد بھیجدیں مضمون میں امید ہے کہ تکلف اور آورد نہ ہوگا،

عزیزی عمر احمد سلمہ کا ایک خط دہلی سے ملا جس میں انھوں نے علی گڑھ یونیورسٹی میں ایک دینیات کے ریڈر کی خالی جگہ کا اشتہار اخباروں میں دیکھا ہے، ان کی خواہش ہے کہ وہ جگہ آپ قبول کریں کہ قرب حاصل ہو، اشتہار میں نے بھی بعد کو دیکھا، اگر میرا خیال یہ ہے کہ یہ وہ جگہ ہے جس پر مولوی عبد اللطیف صاحب ہیں، ان کی عمر قانونی ملازمت کے حدود سے خارج تھی، مگر مولانا شیروانی صاحب کے چونکہ وہ ہم درس اور رفیق طالب علم ہیں اس لیے ان کی ہمدردی ان کے ساتھ ہے، باوجود خارج از عمر ملازمت ہونے کے بحیثیت ماہر فن کے ان کو چند سال کے لیے عارضی طور پر رکھا گیا تھا، وہ مدت پوری ہوگئی ہے اور اس کا اشتہار ہو رہا ہے، اور اگر دوبارہ شیروانی صاحب پھر وہی کریں جو پہلے کر چکے ہیں تو امید نہیں، ورنہ امکان ہے،

میں مولانا شیروانی صاحب کو بھی لکھتا ہوں اور مولوی عمر احمد صاحب کو لکھتا ہوں کہ وہ قریب ہیں، علی گڑھ سے تحقیق کریں کہ کیا صورت ہے، ابھی اس جگہ پر دوبارہ وہی رہیں گے یا کسی دوسرے کے لیے توقع ہے۔

یہ خط قلت فرصت کے سبب اپنے کاتب سے لکھوا لیا ہے، امید کہ اس میں مضائقہ نہ سمجھا جائے گا۔ مضمون موعودہ جلد بھیجدیں۔

دعا کا طالب اور نصائح کا محتاج

والسلام

ہیچمدان سلیمان — ۳ رمضان المبارک سنہ ۱۳۶۲ھ

دار المصنفین اعظم گڈھ
۲۰ ستمبر ۱۹۴۳ء

میرے مکرم، زاد مجدکم

السلام علیکم۔ اس سے پہلے ایک لفافہ لکھ چکا ہوں اور موت العالم کی اصلاح شدہ کاپی بھی بھیجی ہے، پھر کل وہ معارف بھیجا ہے جس میں آپ کا پہلا مرثیہ ہے، افسوس ہے کہ ایک غلطی رہ گئی ہے، مگر وہ ایسی ہے کہ اہل علم سمجھ لیں گے کہ غلطی ہوگئی ہے،

علی گڈھ کے معاملہ کے نسبت رجسٹرار صاحب کا خط آیا، اس کو آپ کی خدمت میں بھیج رہا ہوں، اور اس جگہ کا جو اشتہار ہوا ہے وہ اصل اشتہار بھی بھیج رہا ہوں، اب آپ جیسا فیصلہ فرمائیں، مگر میں خیال کرتا ہوں کہ چونکہ آپ گورنمنٹ سروس میں ہیں اس لیے آپ کی درخواست آپ کے وائس چانسلر کے ذریعہ سے شاید جائے، اس کی تحقیق کرلیجئے۔

آپ کے مضمون کے لیے تقاضا پہلے کر چکا ہوں، اگر ۲۲ بائیس ستمبر تک مضمون پہنچ گیا تو اگلے پرچہ میں آسکتا ہے، ورنہ دیر ہوگی،

والسلام

سید سلیمان

میری طبیعت خراب ہے اس وجہ سے خط دوسرے سے املا کرایا ہے۔

اعظم گڈھ

محب کرم دام فضلکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ، میں اپنی بچی کی علالت شدیدہ کے سبب جلد جواب نہ دے سکا، بحمد اللہ اب وہ اچھی ہے۔

افسوس ہے کہ ریاست کے محکمہ تعلیم کی طرف سے جواب آگیا کہ تنخواہ میں اضافہ نہیں ہو سکتا، یعنی وہی دو سو، مفتی کی تنخواہ کچھ زیادہ ہے، مگر اس جگہ کے لیے مفتی محمد شفیع صاحب کی تحریک ہو چکی ہے، ان سے بھی خط وکتابت ہے، اگر انھوں نے منظور نہ کیا تو پھر اس جگہ کے لیے آپ کا نام پیش کر سکتا ہوں، ان کا نام پہلے سے پیش تھا۔

بہرحال آپ جو سامان یا فیصلہ ڈابھیل وغیرہ کا کر رہے ہیں، اس کو جاری رکھیے اور تشریف لے جایئے، مگر اپنے کو وعدہ مستحکم و مستمر قیام کا دیکھ پابند نہ کریں، کیا عجب کہ وہ جگہ آپ کو پسند نہ آئے۔

سلہٹ سے ایک خط میرے لیے آیا تھا، شاید ضمناً تمک دیدیتے، مگر میری معذرت پر انھوں نے دوسرے کے لیے تین سو مشاہرہ لکھا ہے، اور الاؤنس گرانی اور مجھ سے کسی مشہور عالم و مدرس کا نام پوچھا ہے، آپ کی کیا رائے ہے؟ ان کا پتہ یہ ہے،

مولوی محمد حسین صاحب پرنسپل گورنمنٹ مدرسہ سلہٹ،

آپ اجازت دیں تو میں لکھوں، لیکن میں بھوپال کو پسند کرتا ہوں، وجوہ صاف ہیں،

والسلام

سید سلیمان

۲۴ رج ۱۳۶۴ھ

ادبیات

غزل

از جناب جگناتھ آزاد

کب ہوا ممکن وہ دیوانوں کا دیوانوں کیساتھ
یہ جو ہے برتاؤ فرزانوں کا فرزانوں کے ساتھ

جہل کے طوفاں میں دیوانگی کی لہر پر
میں نے دیکھے چند فرزانے بھی دیوانوں کے ساتھ

میں بتاؤں بھی تو میری بات کو پہنچے گا کون
کیا کیا فصل بہاراں نے گلستانوں کے ساتھ

جادۂ منزل! وہ اب کیا جائے اپنوں کے قریب
زندگی جس نے بسر کر دی ہو بیگانوں کے ساتھ

دامنِ فرزانگی میں نے نہ چھوڑا ہاتھ سے
میرا نازک وقت گذرا اگرچہ دیوانوں کے ساتھ

ساتھ ارمانوں کے وہ بھی ہاتھ سے جاتا رہا
دل نے پیمانِ وفا باندھا تھا ارمانوں کے ساتھ

اب بھی قائم ہے مرا انسانیت پہ اعتقاد
کچھ سہی برتاؤ انسانوں کا انسانوں کے ساتھ

دید کے قابل ہوا کرتا ہے ساحل کا سکوت
جب سفینہ کوئی چل پڑتا ہے طوفانوں کے ساتھ

یہ جو ہیں اشعار میرے داستانیں ہی نہیں
کچھ حقایق بھی ہیں وابستہ ان افسانوں کے ساتھ

بتکدے میں برہمن آزاد کو آنے نہ دے
ربط اس کافر کا ہے گہرا مسلمانوں کے ساتھ

غزل

از جناب تسکین قریشی

عشق میں عشق کا حاصل نہیں دیکھا جاتا	تہِ دریا کبھی ساحل نہیں دیکھا جاتا
حسن کو رہگذر عام میں مستانہ خرام	دیکھتا ہوں، مگر اے دل نہیں دیکھا جاتا
منزلیں جوشِ جنوں میں نہیں ڈھونڈی جاتیں	ڈوبنے کے لیے ساحل نہیں دیکھا جاتا
ہم جہاں شورشِ مستی پہ اتر آئے ہیں	پھر وہ خلوت ہو کہ محفل نہیں دیکھا جاتا
بزم احباب ہو یا انجمن حسن وجمال	اس زمانے میں کہیں دل نہیں دیکھا جاتا
زندگی دشت و چمن میں نہیں پائی جاتی	کوئی دیوانہ کامل نہیں دیکھا جاتا
ہم نے دیکھے ہیں بہت غم کے مناظر لیکن	حسن کو محو غم دل نہیں دیکھا جاتا
غیرتِ عشق کی دشوار نگاہی، توبہ!	ان کو بھی اپنے مقابل نہیں دیکھا جاتا
بے طلب بھی کبھی مل جاتی ہے منزل تسکینؔ	ہر کہیں جادۂ منزل نہیں دیکھا جاتا

غزل

از جناب صاحبزادہ سید اعجاز احمد صاحب اجمیری

ستم کرتے کرتے کرم یاد آئے	تمھیں مبتلائے الم یاد آئے
بیاباں نوردی کی پھر یاد آئی	جنونِ محبت کے دم یاد آئے
قفس در قفس زندگانی کے صدقے	چمن در چمن آج ہم یاد آئے
زمانے نے گو مجھکو پابند رکھا	مگر تم تمھاری قسم یاد آئے
وہیں رکھ دیا سر نگاہیں بچھا دیں	جہاں ان کے نقشِ قدم یاد آئے
یہ انداز لطف و کرم رہنے دیجے	کسی کو نہ پایا تو ہم یاد آئے
یہ عالم ہے اعجاز بیچارگی کا	دھواں دل سے اٹھا نہ غم یاد آئے

مطبوعات جدیدہ

البیان فی اعجاز القرآن - بہ ترتیب و تصحیح ڈاکٹر عبد العلیم صاحب، شائع کردہ شعبۂ عربی مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ،

یہ عجالۂ نافعہ مشہور امام تفسیر و حدیث محمد بن محمد الخطابی صاحب معالم السنن کی تصنیف ہے، اعجاز قرآن پر بیشمار ائمۂ تفسیر نے کتابیں اور رسالے لکھے ہیں جن میں خطابی، رمانی، امام رازی اور قاضی ابوبکر باقلانی کی کتابیں بہت مشہور اور قابل اعتماد ہیں، رمانی کا رسالہ آج سے تقریباً ۲۰ برس پہلے ڈاکٹر عبد العلیم صاحب نے ایڈٹ کرکے شائع کیا تھا، اس رسالہ پر ڈاکٹر صاحب کو پی، ایچ، ڈی کی ڈگری ملی تھی، اس کے برسوں بعد امام خطابی کے رسالہ زیر تبصرہ کی تہذیب و تحشیہ کی سعادت بھی موصوف کے حصہ میں آئی، جو ایک مفید علمی خدمت ہے، ڈاکٹر صاحب اگر آیندہ قاضی باقلانی کی کتاب تلاش کرکے شائع کریں تو یہ ان کی ایک بڑی خدمت ہوگی خطابی کا یہ رسالہ گو مختصر ہے لیکن اس میں بعض بڑی کام کی باتیں ہیں، مثلاً نظام معتزلی کی یہ رائے کہ قرآن کے وجوہ اعجاز میں ایک وجہ صرف الہمم بھی ہے، محققین نے تسلیم نہیں کی ہے، لیکن پھر بھی بعض مفسرین بغیر کسی تنقید کے اس رائے کو اپنی کتابوں میں نقل کر دیتے ہیں، امام خطابی نے نام لیے بغیر اس رائے کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ قرآن کی تحدی والی آیتوں سے ٹکراتی ہے، اگر اس رائے کو تسلیم بھی کر لیا جائے تو اس کا مفہوم وہی ہے جو عام طور پر سمجھا جاتا ہے ان المراد بہ غیرہا، انھوں نے اس کی بھی بڑے عمدہ اور موثر پیرایہ میں وضاحت کی ہے کہ قرآن محض اپنی لفظی خوبیوں، فصاحت، بلاغت اور تشبیہ و استعارہ ہی

کے اعتبار سے معجزہ نہیں ہے، بلکہ اپنی تعلیم و تذکیر، نقطۂ نظر اور معنوی حسن کی وجہ سے بھی معجزہ ہے، بعض اور بحثیں بھی عمدہ اور محققانہ ہیں، اس کتاب کی اشاعت سے اسلامی علوم کے مطبوعہ ذخیرہ میں ایک اچھا اور قیمتی اضافہ ہوا ہے،

اصل الاصول۔ تصنیف سید شاہ عبد القادر مہربان، مرتبہ مولوی یوسف صاحب کوکن عمری ایم اے، شائع کردہ مدراس یونیورسٹی، مدراس،

سید شاہ عبد القادر کے آباو اجداد نیشاپور کے رہنے والے تھے، وہاں سے یہ لوگ کشور (اودھ) آئے، ان کا خانوادہ علم و فضل کے اعتبار سے پہلے سے ممتاز تھا، اسی بنا پر ان کے والد سید شاہ شریف الدین خلد آباد کے قاضی مقرر کیے گئے، سید عبد القادر کی والدہ ایک معروف صوفی سید شاہ نظام الدین کی صاحبزادی تھیں، جو اس زمانہ کے مشہور مرتاض بزرگ شاہ کلیم اللہ دہلی کے مرید خاص تھے، ان کی والدہ بھی ان تمام خصوصیات کی حامل تھیں جو ان کے خاندان کا مخصوص امتیاز تھا، سید شاہ شریف الدین نے قاضی مقرر ہونے کے بعد کنتور کے بجائے دکن کو اپنا مسکن قرار دیا اور پھر یہ خانوادہ وہیں کا ہو رہا،

سید شاہ عبد القادر کا خاندان علم و فضل کے ساتھ بادۂ تصوف کا بھی لذت شناس تھا، اس لیے شاہ صاحب کو یہ چیز ورثہ میں بھی ملی تھی، اور خود انھوں نے اپنے ذوق سے بھی اس نشہ کو تیز کر دیا، اور تصوف پر تقریباً نصف درجن کتابیں تصنیف کیں، جن میں غالباً سب سے ضخیم کتاب اصل الاصول ہے، جو اب تک شائع نہیں ہوئی تھی، مولوی یوسف صاحب کوکن قابل ستائش ہیں کہ انھوں نے اس علمی و دینی ذخیرہ کو بڑی محنت سے مرتب کر کے شائع کیا،

اس کتاب میں یوں تو دین و تصوف کے بہت سے مسائل پر بحث ہے، لیکن بنیادی اور اہم بحث وحدۃ الوجود کی ہے، مصنف شیخ ابن عربیؒ کے بڑے حامی اور ان کے رمزیات کے واقف کار

اور شارح ہیں اس لیے جوش حمایت میں انھوں نے شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کی اصطلاح وحدۃ الشہود پر بحث و تنقید کر کے یہ ثابت کرنے کی ہے کہ مجدد صاحب ابتدا میں اس کے قائل تھے، بعد میں انھوں نے اس سے رجوع کر لیا تھا، مجدد صاحب کے مکاتیب جلد ثالث سے مصنف نے اس کا ثبوت دینے کی بھی کوشش کی ہے، مرتب کو اس مسئلہ پر تفصیل سے بحث کرنی چاہیے تھی یا پھر وہ مجدد صاحب کے وہ تمام مکمل مکاتیب حاشیہ میں نقل کر دیتے ...... تاکہ ناظرین ان کی روشنی میں مصنف کی اس نئی رائے کے بارے میں رائے قائم کر سکتے،

اس طرح کے بعض اور مسائل کو چھوڑ کر کتاب کے اور مباحث اہل علم اور خواص کے مطالعہ کے لائق ہیں، خاص طور پر "قرآن عظیم میزان جملہ موازین و معیار ہمہ براہین، تمسک بالکتاب و السنۃ اور لکل آیۃ منہا ظہر و بطن" کی بحث بڑی قیمتی ہے، کتاب کی زبان فارسی ہے لیکن کہیں کہیں مصنف نے عربی سے بھی کام لیا ہے، اس کتاب کو شائع کر کے مدراس یونیورسٹی نے اپنی علم دوستی ہی کا نہیں بلکہ مذہب نوازی کا بھی ثبوت دیا ہے،

صدائے بازگشت۔ از ڈاکٹر زین العابدین صاحب بکیس بھیاروی، کتابت و طباعت متوسط، ۱۹۲ صفحے، پتہ اشاعت منزل، بل روڈ، لاہور،

صدائے بازگشت لکھنؤ کے ایک معروف ہومیوپیتھک ڈاکٹر زین العابدین صاحب قدوائی بکیس بھیاروی کا مجموعۂ کلام ہے، ڈاکٹر صاحب بچپن ہی سے شعر و سخن کا ذوق رکھتے تھے، لکھنؤ آنے کے بعد اس میں اور ترقی ہو گئی، لیکن لکھنؤ کے مخصوص احباب اور اہل علم کے حلقہ سے باہر بحیثیت شاعر ان کا تعارف غالباً پہلی بار اس مجموعہ کے ذریعہ ہوا ہے، اس مجموعہ میں ۱۵۶ غزلیں اور کچھ نظمیں حمد، نعت اور مدح خلفائے راشدین وغیرہ پر ہیں، جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ موصوف کو بیشتر اصناف شاعری پر قدرت حاصل ہے، لیکن ان کو طبعی مناسبت غزل

سے معلوم ہوتی ہے، اور اسی میں انھوں نے زیادہ طبع آزمائی کی ہے۔

بیکس صاحب اودھ کے رہنے والے ہیں، اور ایک مدت سے لکھنؤ میں مقیم ہیں، اس لیے ان کے کلام میں وہاں کی تہذیبی شائستگی ضرور ملتی ہے مگر لکھنوی شاعری کے دوسرے "محاسن" تصنع، رعایت لفظی، سطحی تخیل اور سوقیت سے بالکل پاک ہے، اور عام طور سے خیالات کی بلندی و پاکیزگی اور زبان و بیان کے حسن و دلکشی سے آراستہ ہے، لیکن کہیں کہیں لفظی اور معنوی خامیاں بھی ہیں، مگر اس سے کلام کی مجموعی خوبی پر اثر نہیں پڑتا۔

ان کے کلام کی خوبی کی ایک سند یہ بھی ہے کہ اس مجموعہ میں ڈاکٹر حفیظ سید صاحب، اقبال سہیل مرحوم اور شیخ فضل الرحمن کے مقدمے اور تبصرے وغیرہ بھی ہیں، جو بجائے خود نہایت مفید ہیں، اور ان سے نفس شاعری اور خود ڈاکٹر صاحب کے کلام کے سمجھنے میں مدد ملتی ہے، مصنف کے قلم سے ایک مختصر افتتاحیہ بھی ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ محض شاعر ہی نہیں بلکہ اچھے نثر نگار بھی ہیں، مجموعی حیثیت سے صدائے بازگشت اصحاب ذوق کے مطالعہ کے لائق ہے۔

سوشلزم۔ از جناب وحید الدین خاں صاحب، چھوٹی تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۷۶، قیمت ۵۰ نئے پیسے، پتہ: مکتبہ جماعت اسلامی، رام پور، یو پی۔

اس رسالہ میں سوشلزم کو ایک غیر اسلامی نظریہ ثابت کیا گیا ہے، اور اس خیال کی پوری تردید کی گئی ہے کہ اسلام محض ایک مذہبی اور سوشلزم صرف معاشی نظریہ ہے، لائق مصنف نے بڑی خوبی سے مارکسی اور دوسرے مستند اشتراکی مفکرین کے اقوال کی روشنی میں سوشلزم کے فلسفہ پر بحث کر کے اور اس کی عملی مثالیں دیکر بتایا ہے کہ یہ نظریہ اسلام کے مزاج اور طبیعت کے بالکل خلاف ہے، اور آخر میں اجتماعی ملکیت کے اشتراکی تصور کو ناقابل تردید دلائل سے غیر اسلامی ثابت کیا ہے، یہ رسالہ گو مختصر ہے لیکن پر مغز اور "بقامت کہتر بقیمت بہتر" کا مصداق ہے، اشتراکی طلسم کے فریب خوردوں کے لیے اس کا مطالعہ بہت مفید ہوگا۔

"م، ج"